قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نضر اللہ امرأ سمع منا شیئا فبلغہ کما سمع

ہدیہ بخدمت جناب پروفیسر ڈاکٹر ہمایوں کبیر وزیر ثقافہ دہلی

ایضاح البخاری (۲)

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اعمال کی مستند
اور کامیاب شرح۔ اکابر کی تحقیقات اور تمام شروح کا عطر
تراجم ابواب پر محققانہ کلام زندہ اسلوب کے ساتھ پہلی بار اردو زبان میں

از افادات :-

فخر الاسلام، یادگار اکابر، امینِ شیخ الہندؒ وارثِ انور شاہؒ
جانشینِ شیخ الاسلام حضرت مولانا، السید فخر الدین احمد صاحب
شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند و صدر جمیعۃ علماء ہند

...ے :- ریاست علی بجنوری
...ع :- نعمان الحق فاروقی

ناشر: مکتبہ مجلسِ قاسم المعارف دیوبند یوپی

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نضّر اللہ امرأ سمع منا شیئا فبلغه کما سمعه

ایضاح البخاری

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اعمال کی مستند
اور کامیاب شرح۔ اکابر کی تحقیقات اور تمام شروح کا عطر
تراجم ابواب پر محققانہ کلام زندہ اسلوب کے ساتھ پہلی بار اُردو زبان میں

از افادات :-

فخر الاسلام، یادگار اکابر، امینِ شیخ الہندؒ، وارثِ انور شاہؒ
جانشینِ شیخ الاسلام حضرت مولانا، السید فخر الدین احمد صاحبؒ
شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند و صدر جمعیۃ علماء ہند

:- ریاست علی بجنوری
:- لقمان الحق فاروقی

مکتبہ مجلسِ قاسم المعارف دیوبند، یو، پی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً و مسلماً - اما بعد کتاب ایضاح البخاری مؤلفہ در جتہ عزیزی محترم
جناب مولوی ریاست علی بجنوری ادام اللہ فیوضہ کو جو کہ درحقیقت میری ان
تقریرات کا مجموعہ ہے جسکو عزیز موصوف نے بزمانہ درس بخاری شریف ۱۳۸۳ھ و ۸۴ھ
میں درس کے ساتھ ساتھ قلم بند کیا تھا - پھر اگلے سال مکرر سماعت کیوقت اپنے
نوشتہ میں اصلاحات اور اضافات کرتے رہے تھے احقر نے حرفاً حرفاً سنا اور
کہیں کہیں حسب ضرورت الفاظ کا ردوبدل بھی کیا - مؤلف کی محنت بفضلہ تعالیٰ بحسن
خداوند کریم قبول فرمائے اور کتاب ہذا کے ثمرات سے خود مؤلف اور دیگر حضرات اہل علم
اور طلبہ علوم دینیہ کو حظ وافر عطا فرمائے آمین - اس کتاب میں سوانح امام بخاری
کا بھی ضروری حصہ شامل ہے - اسکے بعض مضامین خود مؤلف نے دیگر مستند کتابوں
سے اخذ کرکے اضافہ کئے ہیں - نیز ایک مختصر حصہ احقر کی سوانح کا بھی آگیا ہے
جسکو بامرار عزیزی موصوف نے مسز الات کیذریعہ مرتب کیا ہے - خدا شاہد ہے
کہ اس میں میری خواہش کا اصلا دخل نہیں خداوند کریم عزیز موصوف کو اسکا بہتر صلہ
عطا کرے اسطرح سے اس گنہگار کے لئے بقاء ذکر کا ایک راستہ قائم کر دیا -
میری خواہش ہے کہ طلبہ حدیث اس کتاب کے مطالعہ سے ضرور فائدہ اٹھائیں
اور احقر اور مؤلف کو دعاء خیر سے یاد رکھیں - وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین
وصلی اللہ علی النبی الامی الکریم محمد وآلہ وصحبہ اجمعین العبد مسکین ابو الحسین العبد بلغہ اللہ ..
ولوالدیہ ولاساتذتہ ومشائخہ اجمعین

حضرت الاستاذ مدظلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب الایمان

آغاز کتاب میں وحی کے ذکر اور اس کی عظمت وصداقت کے اثبات سے جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی کہ تمام بندے خداوند قدوس سے متعلق ہیں تو اب دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اس تعلق کا اظہار بھی کیا جائے یعنی یہ اعتراف کیا جائے کہ ہم خداوند قدوس کے پرستار اور فرماں بردار ہیں، اسی مقصد کے لئے امام بخاری علیہ الرحمۃ وحی کے بعد ایمان کے بارے میں ابواب قائم فرمارہے ہیں

ایمان امن سے ماخوذ ہے جس کے معنی سکون واطمینان کے ہیں ایمان دل کی تمام پریشانیوں کا علاج ہے کیونکہ ایمان لانے والے کو مومن بہ کی صداقت وصحت پر کامل اعتماد اور پورا بھروسہ ہوتا ہے اور تصدیق بھی اسی یقین کامل کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے ، ایمان کو تصدیق کے معنی میں اسلئے استعمال کرتے ہیں کہ انسان نے جس کی بھی تصدیق کردی گویا اسے اپنی تکذیب سے مامون کردیا ، مومن کو بھی مومن اسی لئے کہتے ہیں کہ لوگ اپنی جان ومال کے بارے میں اس سے مامون ہوتے ہیں ۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

المومن من امنه الناس علی دمائهم واموالهم اوکما قال مشکوٰۃ کتاب الایمان	مومن وہ ہے کہ جس سے لوگ اپنی جان ومال کے بارے میں مامون رہیں

اگر اس لفظ ایمان کا تعلق ذات خداوندی سے ہو تو اس کے معنی تعظیم وتمجید کے ہوں گے اور اس وقت صلہ میں باء کا استعمال کیا جائے گا جیسے آمنت باللہ اور اگر اس کا تعلق اخبار سے ہو تو اس کے معنی تسلیم واقرار کے ہوں گے اور اس وقت صلہ میں لام کا استعمال کیا جائے گا جیسے

ما انت بمؤمن لنا پ ۱۲ ر ۱۲	آپ ہماری بات نہ مانیں گے

نیز لغوی اعتبار سے فعل ایمان لازم بھی ہے اور متعدی بھی ، اس لئے کہ جب ہمزۂ افعال فعل متعدی پر داخل ہوتا ہے تو اسے

کرام چند باتوں کا خیال رکھیں تو یہ سلسلہ بہت جلد ترقی کر سکتا ہے

(۱) ایضاح البخاری کا ہر ممبر اپنے حلقۂ اثر سے کم از کم ایک خریدار ضرور بنائے

(۲) علمی شخصیتوں اور عربی مدارس کے جو پتے ایضاح البخاری کے لئے مفید ہو سکتے ہوں ان کو قارئین کرام براہ مہربانی منیجر مجلس قاسم المعارف کے پتہ پر ارسال کر دیں۔

(۳) اندازہ یہ ہے کہ دو ماہی پروگرام کی صورت میں چار سال کی مدت میں چوبیس یا پچیس جز (تقریباً ۲۵۰۰ صفحات) پر یہ کتاب تمام ہو جائے گی، ان اجزاء کی قیمت مع محصول ڈاک ..... ہوتی ہے۔ آپ چالیس روپیہ یکمشت مجلس کے نام ارسال فرما دیں تو اس صورت میں کتاب آپ کے پاس پہونچتی رہے گی۔ اس میں دو فائدہ ہوں گے آپ کو کھلے طور پر دس روپیہ کا فائدہ ہوگا اور مجلس کے پاس ایک معتد بہ رقم پہونچ جائے گی۔ تو بہ فراغت ہر ماہ کی اشاعت اپنے وقت پر آتی رہے گی

(۴) مجلس قاسم المعارف نے ممبر بنانے والے حضرات کے لئے مندرجہ ذیل رعائتیں رکھی ہیں

(۱) جو صاحب ایضاح البخاری کے پانچ مستقل خریدار فراہم کریں گے انہیں حسب فرمائش ایضاح کا ایک جز بہ طور ہدیہ پیش کیا جائے گا

(۲) دس مستقل خریدار بنانے پر پانچ جز ہدیہ پیش کئے جائیں گے

(۳) اور پچیس خریدار بنانے پر انہیں اعزازی طور پر مستقل ممبر تصور کر لیا جائے گا اور مکمل ایضاح ہدیہ پیش کیا جائیگا

(۵) قارئین ایضاح یقیناً علمی اور دینی کتابیں حسب ضرورت خرید فرماتے ہیں اس سلسلہ میں مجلس قاسم المعارف کا اپنا عظیم الشان مکتبہ ہے جس میں ہمہ وقت جملہ علوم و فنون اسلامیہ کی ملکی و غیر ملکی مطبوعات شروح و حواشی وغیرہ دستیاب ہوتی ہیں۔ اگر آپ کسی موضوع پر کوئی خاص کتاب چاہتے ہوں تو اس کی آسان صورت یہ ہے کہ آپ اپنی پسند سے مطلع کریں، مکتبہ آپ کے لائق کوئی کتاب منتخب کر کے اس کی قیمت سے آپ کو مطلع کر دیگا۔ مجلس نے ایسے حضرات کے لئے انتخاب کا خاص اہتمام کیا ہے۔ شرط یہ ہے کہ آپ اپنی تعلیمی استعداد اور مذاق سے پوری طرح مطلع کر دیں

(۶) ممبران کرام کے لئے قاسم المعارف کی مطبوعات پر کم از کم ۲۵ فیصد کمیشن اور دوسری مطبوعات پر کم از کم ۱۲ فیصد کمیشن دیا جاتا ہے۔ دیگر مراعات کے لئے قاسم المعارف کے پتہ پر رجوع کریں

ناظم قاسم المعارف دیوبند

فلما جاءھم ما عرفوا کفروا بہ فلعنۃ اللہ علی الکافرین (پ ۱ ع ۱۱)

پھر جب وہ چیز آپہونچی جس کو وہ پہچانتے ہیں تو اس کا انکار کر بیٹھے، سو خدا کی مار ہو ایسے منکروں پر ــــ

ان تمام آیات میں یہ بات مشترک ہے کہ یہ لوگ پیغمبر علیہ السلام کی صداقت پر یقین کامل کے علی الرغم مومن نہیں ہوئے قرآن کریم میں نہ صرف یہ کہ ایسے لوگوں کی مذمت کی گئی ہے بلکہ ان پر لعنت بھی بھیجی گئی ہے بہرکیف اس موقعہ پر یقین صداقت بھی ہے اور انکار صداقت بھی، اس لئے فقہاء نے یہ قید بھی لگائی ہے کہ یقین کے ساتھ اقرار لسانی اور تصدیق وتسلیم قلبی بھی ضروری ہے، متکلمین نے بھی اس تسلیم واقرار کو برقرار رکھا لیکن جزو قرار دینے کے بجائے شرط قرار دیا، یہ شرط اس لئے بھی ضروری ہے کہ دنیوی معاملات تمام ہی اظہار ایمان پر موقوف ہیں، ہاں اگر اظہار اسلام سے کوئی معقول عذر مانع ہو تو دوسری بات ہے لیکن طلب، قدرت اور موقعہ کے میسر ہونے کے باوصف بھی اگر گریز ہے تو یہ ضد اور کفر کی واضح دلیل ہے اور قرآن کریم نے اسی کو جحود سے تعبیر کیا ہے

انہیں منکرین صداقت کے یقین وتصدیق کو ایمان سے خارج کرنے کے لئے صدر الشریعہ نے ایک اور راہ نکالی کہ تصدیق شرعی دراصل اس تصدیق اصطلاحی سے مختلف ہے اور یہ اس لئے کہ حکماء کی اصطلاح میں تصدیق کا اطلاق اضطراری اور اختیاری دونوں پر آتا ہے لیکن یہاں کا معاملہ کچھ اور ہے کیونکہ ایمان تمام اعمال میں اصل اور دارو مدار ہے، اسی پر ثواب بھی دیا جائیگا اور ثواب کے متعلقات کا اختیاری ہونا ضروری ہے کیونکہ اضطراری امور پر ثواب کے کوئی معنی نہیں، مستحق مدح اور لائق انعام واکرام وہی شخص ہوسکتا ہے جو ہر طرح کی قدرت کے باوجود صرف اچھے اعمال اختیار کرے

اس ارشاد کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان لوگوں کی تصدیق آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے باعث اضطراری تھی، نیز سابق کتابوں کی بیان کردہ علامتیں ایک ایک کرکے صادق آرہی تھیں، جس سے اضطراری طور پر تصدیق کی نوبت آجاتی تھی، غرض صدر الشریعۃ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو تصدیق ایمان کی حقیقت ہے اس کے ساتھ انکار جمع ہی نہیں ہوسکتا کیونکہ ایک صاحب عقل ایک بار کسی چیز کے اقرار کے بعد اس کا انکار نہیں کرتا کیونکہ یہ سفاہت کی علامت ہے

علامہ تفتازانی نے ایک اور راہ نکالی کہ وہ معرفت حقہ یقینیہ جو ان منکرین صداقت کو حاصل تھی از قبیل تصورات ہے، اسے علامہ کے نزدیک تصدیق کہنا ہی درست نہیں ہے کیونکہ تصدیق علامہ علیہ الرحمہ کے نزدیک اس یقین کا نام ہے جس کے ساتھ تسلیم واقرار بھی شامل ہو گویا صدر الشریعہ نے جس تصدیق کو اضطراری کہا تھا علامہ نے اس کے تصدیق ہونے ہی سے انکار کردیا، علامہ تفتازانی کے ارشاد کے مطابق تصدیق

متعدی بدو مفعول بنا دیتا ہے یا لازم ، اگر یہاں آمنت کو متعدی بدو مفعول کہیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میں نے اپنی تکذیب سے مامون کر دیا اور اگر اسے لازم قرار دیں تو معنی یہ ہوں گے کہ آپ جو کچھ فرما رہے ہیں اس پر مجھے پورا اعتماد ہے ، متعدی ہونے کی صورت میں ایمان کے معنی تصدیق اور لازم ہونے کی صورت میں معنی وثوق ہوں گے

ایمان اصطلاح شریعت میں لیکن چونکہ ایمان ایک حقیقت شرعی ہے جہاں ہر شے کی تصدیق مقصود نہیں اس لئے ہر شے کی تصدیق کا نام ایمان نہیں رکھا جائیگا چنانچہ السماء فوقنا والارض تحتنا کی تصدیق کا نام ایمان نہیں ہے بلکہ فقہاء امت اور متکلمین اسلام کے بیان کے مطابق ایمان اصطلاح شریعت میں ان مخصوص امور کی تصدیق کا نام ہے جو بارگاہ نبوت سے بدرجۂ ضرورت ثابت ہیں ، بعض اکابر امت نے اس کے ساتھ ایک اور بھی قید کا اضافہ کیا ہے کہ تصدیق شرعی مغیبات سے متعلق ہوتی ہے قرآن کریم کا ارشاد ہے

یومنون بالغیب پ ۱ ر ۱ — وہ چھپی ہوئی چیزوں پر یقین لاتے ہیں

جمہور فقہاء و متکلمین کی ارشاد فرمودہ تعریف میں دو لفظ محتاج بیان ہیں ایک تصدیق اور دوسرے ضرورت

تصدیق اصطلاح حکماء میں اذعان کا نام ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ تصدیق علم و ادراک ہی کا دوسرا نام ہے یا یہ لواحق علم میں سے ہے ، محقق بات یہ ہے کہ تصدیق لواحق علم میں سے ہے بالفاظ دیگر تصدیق محض علم کا نام نہیں ہے جو اختیاری و غیر اختیاری دونوں کو عام ہے بلکہ تصدیق ایک ارادی چیز ہے اور حضرت علامہ کشمیری علیہ الرحمہ کے الفاظ میں جان لینے کا نام ایمان نہیں ہے بلکہ ایمان مان لینے کو کہتے ہیں ورنہ ابولہب ، ابوطالب اور فرعون بھی مومنین کے زمرہ میں داخل ہو جائیں گے کیونکہ علم کی حد تک ان تمام حضرات کو انبیاء علیہم السلام کی صداقت کا یقین تھا حالانکہ ان کے کفر پر امت کا اتفاق ہے

اس ماننے اور جاننے کے فرق کو واضح طور پر سمجھنے کیلئے میرزاہد بحر العلوم اور دوسرے اکابر علماء کے اقوال پر نظر ڈال لینی چاہئے ، یہ حضرات تصدیق کو لواحق علم میں سے قرار دیتے ہیں کیونکہ علم انکشاف کا نام ہے اور انکشاف کا تعلق محکوم بہ محکوم علیہ اور نسبت سے ہوتا ہے ، لیکن تصدیق صرف اسی انکشاف کا نام نہیں ہے بلکہ خارجی دلائل اس انکشاف کو تصدیق تک لیجاتے ہیں چنانچہ علماء محققین کے نزدیک تصدیق عین علم نہیں ہے اور یہ اس لئے بھی کہ مومن ہونے کے لئے محض جان لینا بھی کافی نہیں ہوتا ، قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ارشاد ہے

جحدوا بہا واستیقنتہا	ظلم اور تکبر کی راہ سے ان کے منکر ہو گئے حالانکہ
انفسہم پ ۱۹ ر ۱۶	ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا
یعرفونہ کما یعرفون	وہ لوگ رسول کو پہچانتے ہیں جس طرح اپنے
ابناءہم پ ۲ ر ۲	بیٹوں کو پہچانتے ہیں

نزدیک اجزاء مکملہ ہیں معتزلہ اور خوارج اعمال کو تصدیق کی طرح ایمان کا جزء مانتے ہیں، ان کے یہاں مرتکب کبیرہ منکر تصدیق کی طرح ایمان سے خارج ہے

آگے چلکر تفصیل خروج میں معتزلہ اور خوارج میں بھی اختلاف ہوگیا ہے کہ خوارج مرتکب کبیرہ کو ایمان سے خارج مانتے ہیں بایں معنی کہ ایسا شخص کافر ہے اور معتزلہ منزلۃ بین المنزلتین کے قائل ہیں یعنی مرتکب کبیرہ ان کے نزدیک نہ مومن ہے نہ کافر، مومن اس لئے نہیں کہ اس نے ایک بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے جو ایمان کے منافی ہے اور کافر اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ ابھی تصدیق باقی ہے، مگر اس اختلاف کے باوجود نتیجہ میں دونوں فریق متفق ہیں کہ ایسا شخص مخلد فی النار رہوگا، لیکن اہل سنت کا اتفاق ہے کہ اعمال حقیقت ایمان میں داخل نہیں، اسی لئے جو اہل سنت اعمال کو داخل ایمان مانتے ہیں ان کا یہ مطلب ہے کہ اعمال کمال ایمان کے لئے ضروری ہیں، ان کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ اعمال حقیقت ایمان میں داخل ہیں اور تصدیق کی طرح ایمان کا جز ہیں، اسی طرح جو اہل سنت داخل نہیں مانتے ان کا مفہوم یہ ہے کہ اعمال حقیقت ایمانی میں تو داخل نہیں مگر ایمان کی ترقی اور نمو کے لئے ضروری ہیں یہیں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جو لوگ امام اعظم علیہ الرحمۃ کو صرف اس لئے مرجیہ میں شمار کرتے ہیں کہ انہوں نے اعمال کو جزء ایمان نہیں قرار دیا وہ سخت غلط فہمی کا شکار ہیں اس لئے کہ صرف عنوان والفاظ کے اتحاد سے معانی کا اتحاد لازم نہیں ہے

احناف کو مرجیہ کہنے میں بہت سے لوگوں نے تعدی سے کام لیا ہے کچھ لوگوں نے تو اس کا انتساب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ کی طرف کیا ہے کہ انھوں نے غنیۃ الطالبین میں احناف کو مرجیہ لکھا ہے لیکن بہ تحقیق ثابت ہے کہ یہ سب دسیسہ کاری ہے، اس کتاب کے تین نسخے دیکھنے میں آئے ہیں، پہلے نسخہ میں تو سرے سے اس کا ذکر ہی نہیں ہے اور جب دوبارہ طبع ہوئی تو ناشرین اہل حدیث نے اسے حاشیہ پر لکھدیا اور جب تیسری بار طبع ہوئی تو اسے اصل متن میں داخل کردیا گیا، لیکن یہ سب غلط ہے عبدالکریم شہرستانی نے کتاب ملل ونحل میں یہ تصریح لکھا ہے کہ مرجیہ کی دو قسم ہیں، ایک مرجیہ اہل بدعت اور دوسرے مرجیہ اہل سنت، مرجیہ اہل بدعت نے اعمال کو بالکل لغو اور مہمل قرار دیا ہے یعنی اگر ایمان حاصل ہے تو پھر کوئی گناہ بھی اسے مضمحل نہیں کرسکتا اور دوسرے مرجیہ اہل سنت ہیں جو اعمال کو ایمان کا جز تو نہیں کہتے لیکن اعمال سے کسی درجہ میں بے التفاتی بھی ان کے یہاں روا نہیں سمجھی جاتی بلکہ وہ پوری سختی کے ساتھ اعمال پر کاربند رہتے ہیں اور بے عمل کو فاسق کہتے ہیں، شہرستانی نے لکھا ہے کہ احناف کو دوسری قسم میں داخل کیا گیا ہے، لیکن اگر ان تمام حقائق و تصریحات کے علی الرغم بھی احناف کو مرجیہ کہنا روا ہے تو محض اتحاد لفظی کے ناتہ سے، محدثین، اور ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کو معتزلہ اور خوارج کی صف میں لے آنا ہوگا جو کسی طرح بھی درست نہیں

اصطلاحی اور ایمان میں مساوات کی نسبت ہوجاتی ہے جبکہ صدر الشریعہ کے ارشاد میں تصدیق کو ایمان سے عام قرار دیا گیا ہے ——— لیکن ان تمام باتوں میں سب سے زیادہ واضح اور پسندیدہ بات یہ ہے کہ ایمان مان لینے کا نام ہے صرف جاننے سے کام نہیں چلتا، بالفاظ دیگر ایمان از قبیل ادراکات نہیں بلکہ از قبیل ارادات ہے۔

ایمان کی تعریف میں دوسرا محتاج بیان لفظ ضرورت تھا، ضرورت کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا دین ہونا تواتر سے ثابت ہو خواہ وہ بات اپنی جگہ بدیہی ہو یا نظری، اور پھر وہ بات اس درجہ مشہور ہوگئی ہو کہ عوام وخواص کی ایک قابل ذکر تعداد نے اسے جان لیا ہو جیسے، توحید، نبوت، ختم رسالت، حشر ونشر، عذاب قبر وغیرہ یہ تمام چیزیں اپنی جگہ نظری ہیں لیکن انکا منجملۂ دین ہونا نظری نہیں ہے ضرورت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اسے ہر شخص جانتا ہو خواہ اس نے تحصیل علم کے سلسلہ میں کتنی ہی لاپرواہی سے کام لیا ہو اور نہ ضرورت کا یہ مطلب ہے کہ اس پر عمل کرنا ضروری ہو کیونکہ دین میں ایسی بھی چیزیں ہیں جن کی اباحت کا اعتقاد ضروری ہے حالانکہ ان پر عمل کرنا ضروری نہیں، اس کی مثال میں مسواک کو پیش کیا جاسکتا ہے اس لئے ضرورت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کا منجملۂ دین ہونا تواتر سے ثابت ہو، خواہ فی نفسہ وہ حکم نظری ہو اور خواہ اس پر عمل کرنا بھی ضروری نہ ہو

ایمان کے بارے میں مختلف مذاہب آگے چلکر اس ایمان کے بارے میں اختلاف ہوا ہے کہ آیا مطلق تصدیق کافی ہے یا اس کے ساتھ اور بھی کوئی قید ہے، اس اختلاف کے نتیجہ میں متعدد مذاہب پیدا ہو گئے ہیں، پہلا اختلاف تو ایمان کی ترکیب وبساطت کے بارے میں ہے، بسیط ماننے والوں کی دو جماعتیں ہیں، ایک جماعت کہتی ہے کہ ایمان کی حقیقت صرف تصدیق ہے اعمال اور اقرار ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں، اس کی تفصیل میں پھر اختلاف ہوگیا ہے امام اعظم اور فقہاء علیہم الرحمہ کہتے ہیں کہ ایمان صرف تصدیق کا نام ہے لیکن اعمال ایمان کی ترقی کے لئے نہایت ضروری ہیں، اور جہمیہ کہتے ہیں کہ اعمال بالکل غیر ضروری ہیں، ایمان لانے کے بعد نماز ادا کرنا اور کھانا کھانا دونوں برابر ہیں، بسیط ماننے والوں میں دوسری جماعت مرجیہ اور کرامیہ کی ہے جو صرف اقرار کو ایمان کی حقیقت بتلاتے ہیں، تصدیق اور اعمال اس کا جز نہیں صرف یہ شرط ہے کہ اقرار لسانی کے ساتھ دل میں انکار نہ ہونا چاہیئے۔

مرکب ماننے والوں کا مطلب یہ ہے کہ ایمان، تصدیق، اقرار اور اعمال جوارح کے مجموعہ کا نام ہے، ان حضرات میں باہم اختلاف ہے کہ آیا ان تمام اجزاء کی جزئیت ایک ہی شان کی ہے یا اس میں تفاوت ہے، اہل حق کے نزدیک تصدیق اصل اصول ہے، اگر تصدیق نہ رہے گی تو ایمان جاتا رہے گا، رہا اقرار تو وہ اجراء احکام کے لئے ضروری ہے، اور اسی طرح اقرار عند الطلب بھی ضروری ہوجاتا ہے اور اعمال اہل سنت کے

برابر ایمان ہو اسے نکال لو جس کے دل میں گیہوں کے برابر ایمان ہو اسے نکال لو تا اینکہ جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہو اسے نکال لو چنانچہ ان تمام لوگوں کو جنت سے نکالنے کے بعد اعلان ہو جائیگا کہ اب ان لوگوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو جنت میں آنیکا مستحق ہو اس کے بعد حق جل مجدہ فرمائیں گے کہ اب ہمارا نمبر ہے اور خداوند قدوس ان لوگوں کو نکال لیں گے جن کے پاس تصدیق تو تھی مگر عمل کی روشنی بالکل نہ تھی یہ لوگ اپنے پاس تصدیق کا اتنا دھندلا نقش رکھتے تھے کہ جسکو پیغمبر علیہ السلام کی نگاہ بھی نہ دیکھ سکی ، اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کا ایک وہ بھی درجہ ہے جو صرف منجی عن النار رہے

بس یہی وہ مرتبہ ہے جس کے متعلق امام اعظم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ یہ کمی ، زیادتی قبول نہیں کرتا اس لئے کہ اگر اس سے ذرا نیچے اترو تو کفر آجاتا ہے اور زیادتی قبول نہ کرنیکا مفہوم یہ ہے کہ صحت ایمان کے لئے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس سے اوپر کے درجات پر موقوف ہے اور ان اوپر کے درجات کے بغیر دخول جنت ناممکن ہے

گویا اب اجزاء میں مکملہ اور مقومہ ، اور عرفی و شرعی کی تقسیم ہے اور اس کے بعد امام رازی علیہ الرحمہ کا یہ اعتراض بھی درست نہیں کہ ایمان کو چند چیزوں کا مجموعہ قرار دیتے ہو تو پھر غیر عامل کو کافر قرار دینا ہوگا ، کیونکہ جزو کے فقدان سے کل کا فقدان لازم آجاتا ہے لیکن یہاں اجزاء کو مقومہ اور مکملہ پر تقسیم کر دیا گیا ہے اور اس طرح یہ اعتراض اٹھ جاتا ہے کیونکہ اجزاء مقومہ کا فقدان تو واقعی فقدان کل کو مستلزم ہے لیکن اجزاء مکملہ کے فقدان سے کچھ نہیں ہوتا

دوسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم یہ قانون بالکلیہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ جزو کے انعدام سے کل معدوم ہو جاتا ہے ، زائد سے زائد یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی تمامیت میں نقصان آجاتا ہے یا صورت میں تغیر آجاتا ہے ، مثلاً اگر انسان کے بعض اعضاء کاٹ دیئے جائیں یا درخت کی شاخیں تراش دی جائیں تو انسان یا درخت بالکل معدوم نہیں ہو جاتے بلکہ صرف نقصان آجاتا ہے ، اس اعتراض کے رفع کے لئے سب لوگوں نے توجہ کی ہے جن کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے ان اجزاء کو مقوم نہیں بتلایا مکملہ بتلایا ہے

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ تمام اہل سنت کے نزدیک ایمان صرف تصدیق کا نام ہے اور باقی سب کچھ تعبیر کا فرق ہے ، اعمال کا معاملہ یہ ہے کہ اہل سنت کے ایک فریق نے مقابل اور اپنے عصر کی رعایت سے ان کو خارج ایمان بتایا اور جب حالات بدل گئے ، باطل فرقوں کے محاذ مختلف ہو گئے ہو تو اہل سنت کو ان کے مقابلہ کے لئے تعبیر بدلنی پڑی

اہل سنت کے درمیان اس اختلاف کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے ہمیں ایک مرتبہ محدثین اور ائمہ رحمہم اللہ کے ماحول اور عصر پر نظر ڈال لینی چاہیئے ۔ حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ ان اہل حق کا مقابلہ ہر دور میں فرق باطلہ سے رہا ہے اور ان حضرات نے ہمیشہ زمانہ کی مصلحتوں کی رعایت کرتے ہوئے ان کا رد کیا ہے چنانچہ امام اعظم علیہ الرحمہ کے دور میں معتزلہ کا اثر تھا ، انتہا یہ ہے کہ حکومت کا مسلک بھی اعتزال تھا ، امام اعظم نے تقاضائے عصر کے اعتبار سے معتزلہ کی پوری مخالفت کی ، معتزلہ نے اعمال کو جزو ایمان بتلایا تو امام نے انہیں ایمان ہی سے خارج کر دیا اور جب امام شافعی علیہ الرحمۃ کا دور آیا تو کرامیہ سے مقابلہ تھا ، اس لئے امام شافعی نے فرمایا کہ تم اعمال کو ایمان سے بالکل بے تعلق بتلاتے ہو میں کہتا ہوں کہ اعمال داخل ایمان ہیں اور اگر اعمال نہوں تو ایمان خطرہ میں آجاتا ہے

غرض حقیقت تمام اہل سنت کے نزدیک ایک ہے اور تعبیرات کا یہ اختلاف ، اختلافِ اعصار کا نتیجہ ہے ، درحقیقت ایمان دو طرح کا ہے ایک کامل اور دوسرے ناقص ، ایمان کامل کے نتیجہ میں جنت میں دخول اولی متوقع ہے اس کے لئے تصدیق ، اعمال اور اقرار سب ہی کی ضرورت ہے اور ایک وہ ایمان ہے جو خلود فی النار سے منجی ہے اس کے لئے صرف تصدیق بھی کافی ہے ، تصدیق کتنی بھی دھندلی ہو لیکن ایک وقت ایسا آئیگا کہ وہ تصدیق کرنے والے کو جنت میں لے جائے گی کیونکہ ایمان جنت کی چیز ہے اسی لئے مومن جب جہنم میں جائیگا تو اس کا ایمان نکالکر باہر رکھدیا جائیگا جیسا کہ قیدی کا لباس اتار کر رکھ لیتے ہیں اور پھر رہائی کے وقت اسے واپس کر دیا جاتا ہے گویا وہ ایمان جو جنت میں لیجانے کا باعث ہے یا جو کسی بھی وقت جنت میں لیجا سکتا ہے اور خلود فی النار سے منجی ہے صرف تصدیق سے عبارت ہے ، ارشاد ہے

ما من عبد قال لا اله الا الله ثمّ	اللہ کا کوئی بندہ ایسا نہیں ہے جس نے " لا الہ
مات علی ذالک الا دخل الجنة	الا اللہ " کی شہادت دی اور پھر اسی کلمہ پر اس
مشکوٰۃ کتاب الایمان ، متفق علیہ	کا انتقال بھی ہو گیا مگر یہ کہ وہ جنت میں داخل ہوگا

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا وان زنی وان سرق " یعنی خواہ وہ زنا اور چوری کا بھی ارتکاب کرے " اور جب حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے بار بار سوال کیا تو تیسری بار میں آں حضور صلی اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا

وان زنی وان سرق علی رغم انف ابی ذر

معلوم ہوا کہ نجات عن الخلود کے لئے صرف تصدیق بھی کافی ہے ہاں اگر اول دخول کی طلب ہے تو اس کے لئے اعمال کی بھی ضرورت ہوگی کیونکہ نجات عن الخلود کے لئے تو تصدیق کا دھندلا سا نقش بھی کافی ہے ، جب قیامت میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سفارش کی اجازت دی جائے گی تو ارشاد ہوگا کہ جس کے قلب میں جو کے

ترجمہ، باب - رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے اور وہ قول فعل دونوں پر مشتمل ہے اور وہ زیادتی و کمی کو قبول کرتا ہے خداوند قدوس کا ارشاد ہے

لِيَزْدَادُوْا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ۲۶پ ۹ر	تاکہ ان کے پہلے ایمان کے ساتھ ان کا ایمان اور زیادہ ہو
اور وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۱۵پ ۱۲ر	اور ہم نے ان کی ہدایت میں اور ترقی کر دی تھی
اور وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ۱۶پ ۸ر	اور اللہ تعالے ہدایت والوں کو ہدایت بڑھاتا ہے
اور وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ ۲۶پ ۵ر	اور جو لوگ راہ پر ہیں اللہ تعالی ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور ان کو ان کے تقوے کی توفیق دیتا ہے۔
اور وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِيْمَانًا ۲۹پ ۱۵ر	اور ایمان والوں کا ایمان اور بڑھ جائے
اور اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖ اِيْمَانًا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا ۱۱پ ۵ر	اس سورت نے تم میں سے کس کے ایمان میں ترقی دی سو جو لوگ ایماندار ہیں اس سورت نے ان کے ایمان میں ترقی دی ہے
اور فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۴پ ۹ر	سو تم کو ان سے اندیشہ کرنا چاہیئے تو اس نے ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیا
اور وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۲۱پ ۱۹ر	اور اس سے ان کے ایمان اور اطاعت میں اور ترقی ہو گئی۔

اور اللہ کے لئے محبت اور اس کے لئے بغض رکھنا بھی داخل ایمان ہے اور حضرت عمر بن عبد العزیز نے حضرت علی بن عدی کو لکھا کہ ایمان کے لئے فرائض، شرائع، حدود اور سنن ہیں پس جس شخص نے ان تمام چیزوں کو پورا کر لیا اس نے ایمان کو پورا کر لیا اور جس نے ان تمام چیزوں کو پورا نہیں کیا اس نے ایمان کو کامل نہیں کیا پس اگر میں زندہ رہا تو ان چیزوں کو تمہارے لئے بیان کرونگا تاکہ تم ان پر عمل کر سکو اور اگر میں مر گیا تو میں تمہاری صحبت کے لئے حریص نہیں ہوں اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا

وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ۳پ ۳ر	ولیکن اس غرض سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرے قلب کو سکون ہو جائے

بسم الله الرحمن الرحيم

باب قول النبي صلى الله عليه وسلم بني الاسلام
على خمس وهو قول وفعل ويزيد وينقص
قال الله تعالى ليزدادوا ايمانا مع ايمانهم
وزدناهم هدى ويزيد الله الذين اهتدوا
هدى والذين اهتدوا زادهم هدى وآتاهم
تقواهم ويزداد الذين آمنوا ايمانا وقوله
عز وجل ايكم زادته هذه ايمانا فاما الذين
آمنوا فزادتهم ايمانا وقوله فاخشوهم
فزادهم ايمانا وقوله وما زادهم الا
ايمانا وتسليما والحب في الله والبغض في
الله من الايمان وكتب عمر بن عبد العزيز
الى عدي بن عدي ان للايمان فرائض وشرائع
وحدودا وسننا فمن استكملها استكمل
الايمان ومن لم يستكملها لم يستكمل
الايمان فان اعش فسابينها لكم حتى
تعملوا بها وان امت فما انا على صحبتكم
بحريص وقال ابراهيم عليه السلام ولكن
ليطمئن قلبي وقال معاذ اجلس بنا نؤمن
ساعة وقال ابن مسعود اليقين الايمان
كله وقال بن عمر لا يبلغ العبد حقيقة
التقوى حتى يدع ما حاك في الصدر وقال
مجاهد شرع لكم من الدين ما وصى به
نوحا اوصيناك يا محمد واياه دينا واحدا وقال
بن عباس شرعة ومنهاجا سبيلا وسنة دعاءكم ايمانكم

ہے، قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے

اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ — مگر جس شخص پر زبردستی کی جائے بشرطیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو (سورۃ ۱۴ پ ۲۰)

اب رہے اعمال تو جس طرح اقرار حالات کی ترجمانی کرتا ہے اسی طرح یہ اعمال جوارح بھی در اصل اسی ایمان کی تعیین وتائید کرتے ہیں اور ایمان کو مرکب ماننے والے یہ حضرات اعمال کو ایمان کا جزو بتلاتے ہیں، امام بخاری علیہ الرحمۃ کی رائے بھی یہی ہے اسی لئے امام نے ترجمہ کا عنوان "بُنِيَ الاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ" رکھا ہے

لیکن سوال یہ ہے کہ دل سے تصدیق کرنے والے ایسے انسان کو آپ مومن کہیں گے یا نہیں جو موقعہ میسر نہ آسکنے یا تساہل وغفلت برتنے کے باعث کوئی عمل خیر نہ کرسکا، ہم بھی جانتے ہیں کہ آپ اسے مومن فاسق کہتے ہیں کیونکہ ایمان کے لئے تو صرف رضينا بالله ربًّا وبالاسلام دينًا وبمحمد نبيًّا کہنا کافی ہے، گویا آپ کے یہاں بھی جزئیت اس درجہ کی نہیں جسکو عدم ایمان کا باعث قرار دیا جائے بلکہ ایمان کو قوی بنانے کے لئے جس طرح اقرار ضروری ہے اسی طرح اعمال کی بھی ضرورت ہے، کیونکہ ان سے ایمان میں نمو پیدا ہوتا ہے، ہر عمل کا ایک نور اور ہر اطاعت کی ایک روشنی ہے جسقدر طاعات بڑھیں گی اسی قدر انوار بڑھیں گے اور ایمان میں رونق وشادابی آتی چلی جائے گی کیونکہ اگر طاعات نہیں بلکہ معاصی ہیں تو ہر معصیت کی ایک ظلمت ہوتی ہے اور ہر معصیت قلب پر ایک نقطۂ سیاہ پیدا کرتی ہے اور اس نور کی جگہ جو ایمان کا نتیجہ تھا داغ پیدا ہوجاتا ہے، اگر اس داغ کو دعا کے ذریعہ فورًا دھو دیا جائے تو قلب صاف ہوجائیگا ورنہ دوسری معصیت کا داعیہ پیدا ہوگا اور پھر تیسری معصیت کی ترغیب ہوگی، غرض ہر معصیت پر ایک سیاہ داغ قائم ہوتا جائے گا تا اینکہ یہ سیاہی تمام قلب کا احاطہ کرلیتی ہے، قرآن کریم نے اس کی تعبیر اس طرح کی ہے

كلا بل ران على قلوبهم بما كانوا يكسبون — ہرگز ایسا نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال بد کا زنگ بیٹھ گیا ہے (پ ۳۰)

اور جس طرح معاصی کی یہ ظلمت بڑھتی رہتی ہے اسی طرح طاعات کی روشنی نمو پذیر ہوتی ہے اور پھر یہ روشنی دوسری طاعات کے لئے محرک ہوتی ہے یہانتک کہ تمام قلب نور سے معمور ہوجاتا ہے اور اس کے بعد دوسروں کو متاثر کرنے کی طاقت پیدا ہوجاتی ہے

اس پوری گذارش سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ علماء کے درمیان اس مسئلہ میں کوئی حقیقی

اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ جاؤ کچھ دیر ایمان تازہ کریں، اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یقین کل کا کل ایمان ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بندہ اس وقت تک تقویٰ کی حقیقت نہیں پا سکتا جبتک ان باتوں کو نہ چھوڑ دے جو دل میں کھٹکتی ہیں، مجاہد نے شَرَعَ لَكُم مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوحًا کی تفسیر میں فرمایا کہ اے محمد ہم نے آپ کو اور حضرت نوح کو ایک ہی دین کی وصیت کی تھی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ (ولكل جعلنا لكم شرعة ومنهاجًا میں) شرعة سے مراد سبیل اور منهاجا کے معنی سنت کے ہیں

مقصد ترجمہ | امام بخاری علیہ الرحمۃ نے ابتدا ترجمہ میں تین جملے ارشاد فرمائے ہیں اور ان میں ہر پہلا جملہ دوسرے کے لئے بمنزلۂ علت یا ہر دوسرا جملہ پہلے کے لئے بمنزلۂ نتیجہ کے ہے، پہلا جملہ یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم کی گئی ہے اور اگر ان کی تقسیم و تحلیل کی جائے تو ان میں دو طرح کی چیزیں نکلیں گی، ایک اقوال اور دوسرے افعال۔ نتیجے کے طور پر یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایمان قول و فعل کا نام ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایمان قول و فعل سے مرکب ہے اور جب اسلام مرکب ہوا تو بطور نتیجہ یہ بات سمجھ میں آگئی کہ اس میں زیادتی و کمی کی قابلیت ہے کیونکہ جو چیز مختلف اجزاء سے مرکب ہوتی ہے اس میں یقینی طور پر کمی زیادتی کی صلاحیت ہوتی ہے

گویا اب یہاں مستقل طور پر دو مسئلہ ہو گئے ایک مسئلہ ایمان کی ترکیب و بساطت کا ہے اور دوسرا مسئلہ قبولیت زیادت و نقصان سے متعلق ہے

اعمال کی جزئیت کا مسئلہ | اور اگر ایمان صرف تصدیق کا نام رکھا جائے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جمیع ما جاء بہ الرسول کے لئے سر تسلیم خم کر دے تو ایمان ایک بسیط اور ایک غیر ذی اجزاء شی ہوگا اور اگر اس طور پر ایمان کو بسیط تسلیم کر لیا جائے تو زیادت و نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، گو اعمال کا ایمان سے گہرا ربط ہے اور اسی وجہ سے متعدد مقامات پر اعمال کا ایمان پر اطلاق کیا گیا ہے کیونکہ کبھی متعلقاتِ شی کو شی کا حکم دے دیا جاتا ہے بلکہ ایسا اطلاق کلام عرب میں شائع ذائع ہے

اس کے مقابل دوسری رائے یہ ہے کہ ایمان مرکب ہے، ذی اجزاء ہے اور قابل زیادت و نقصان ہے، رہی یہ بات کہ وہ اجزاء کیا ہیں، تو اقرار اس درجہ میں تو سب کے یہاں مسلم ہے کہ جب تک وہ شخص یہ اقرار نہ کرے کہ میں خدا کو ایک مانتا ہوں اور اس کے تمام اوامر و نواہی کو واجب التسلیم سمجھتا ہوں اس وقت تک اسے دنیا مومن نہیں کہہ سکتی، فیما بینہ وبین اللہ جو بھی معاملہ ہو لیکن دنیا میں تمام اسلامی معاملات و احکام کا مدار اسی اقرار پر ہے۔ گو یہ اقرار بعض حالات میں ساقط بھی ہو جاتا

مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۔ پ ۱۷ ع ۷
سو جو شخص نیک کام کرتا ہوگا اور وہ ایمان والا بھی ہوگا، سو اس کی محنت اکارت جانیوالی نہیں

ایک دوسری آیت میں حرف شرط کے ساتھ ملاحظہ ہو

وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ پ ۹
اور اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح کرو اور اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کرو اگر تم ایمان والے ہو۔

اس شرطیت کے انداز میں ذکر کرنے سے معلوم ہو رہا ہے کہ اعمال ایمان سے خارج ہیں کیونکہ شرط اصل شئے سے خارج ہوا کرتی ہے، اب اگر عطف و معطوف کے سلسلہ میں یہ تاویل کر بھی لیں کہ زیادتی اہتمام کی غرض سے ایسا ہوا تو اس شرط اور قید کے ساتھ تعبیر کے بارے میں تو کوئی تاویل بھی نہیں چلتی

(۳) اگر اعمال صالحہ کو جزو ایمان قرار دیا جائے تو ظاہر ہے کہ معاصی ایمان کی ضد قرار دئے جائیں گے اور مسلم ہے کہ کوئی شئے اپنی ضد کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی ان دو باتوں کے تسلیم کر لینے کے بعد کسی بھی معصیت کا اجتماع ایمان کے ساتھ غلط ہوگا، حالانکہ آیات کریمہ میں ایمان کے ساتھ معاصی کا اجتماع پایا جاتا ہے، ارشاد ہے

الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانهم بظلم ۔ پ ۷ ع ۱۵
جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ نہیں ملاتے

اگر یہ درست ہے کہ ایمان معصیت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا تو آیت لم یلبسوا ایمانهم بظلم میں کس طرح درست کہا جائے، ظاہر ہے کہ آیت کی روشنی میں یہ اجتماع درست ہے، ایک اور جگہ ارشاد ہے

وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینهما ۔ پ ۲۶ ع ۱۳
اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو

قتال مومن اتنا بڑا گناہ ہے کہ اسے "قتاله کفر" سے تعبیر کیا گیا ہے، گو یہ کفر وہ نہیں جو حبط اعمال اور خلود فی النار کا سبب ہو مگر لفظ کفر کے ساتھ تعبیر بھی نہایت اہمیت کا پتہ دیتی ہے، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس جرم کے ارتکاب کے وقت بھی مومن ہی سے خطاب کیا گیا ہے حالانکہ یہ ایک شریف نام ہے اور اپنے اطلاق کے لئے شرافت کا طالب ہے، الغرض اگر اعمال صالحہ جزو ایمان ہوتے تو ان

اختلاف نہیں ہے صرف تعبیر کا فرق ہے، اب دوسرا مسئلہ اعمال کے جزر ایمان ہونیکا ہے، علامہ عینی علیہ الرحمۃ اور دوسرے علماء نے اعمال کے ایمان کی حقیقت سے خارج ہونے پر مختلف وجوہ سے استدلال کیا ہے

(۱) پہلی بات تو یہ کہ قرآن کریم میں جہاں بھی ایمان واعمال کا ذکر کیا ہے وہاں اعمال کو بصیغۂ عطف ذکر فرمایا ہے، اور مسلم ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت ہوتی ہے مثلاً

اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰت ۔ پ ۱۶ ر ۳ ۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے

اگر یہ اعمال صالحہ ایمان کا جز ہوتے تو ان کا الگ ذکر کرنا محض تکرار ہو جاتا، اسلئے بصیغۂ عطف اعمال کا ذکر تغایر کی دلیل ہے، جواب دینے والوں نے اس کے جوابات دئے ہیں، مثلاً یہ کہ اعمال کا ذکر زیادتیٔ اہتمام کی غرض سے ہے یعنی چونکہ ایمان کے کئی جز ہیں اور ایسا ممکن ہے کہ کسی جز سے ذہول ہو جائے اسلئے تصریح کر کے توجہ دلائی جا رہی ہے کہ اجزار ایمان میں اعمال کو خاص امتیاز حاصل ہے اور یہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے خاص توجہ کے طالب ہیں جیسے ملائکہ کے ذکر کے بعد مزید اہتمام کی غرض سے جبریل ومیکائیل کا ذکر کرتے ہیں، اس کا یہ مفہوم نہیں کہ جبریل ومیکائیل زمرۂ ملائکہ سے خارج ہیں ہاں صرف اتنی بات ہے کہ جبرئیل ومیکائیل خصوصی امتیاز کے مالک ہیں، اسی طرح حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ ۔ اور فاکہۃ ونخل ورمان ۔ صلوٰۃ وسطیٰ اور نخل ورمان کا علیحدہ ذکر بھی مزید اہتمام کی غرض سے ہے

لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے، مزید اہتمام اس چیز کا ہوتا ہے جو خصوصیات میں ذکر شدہ چیز سے زیادہ اہم ہو، جیساکہ اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہے۔ اور یہاں ایمان اعمال سے زیادہ اہم ہے کیونکہ ایمان ہی اصل ہے۔ نیز یہ کہ ہمارا استدلال صرف عطف ومعطوف پر ہی منحصر نہیں بلکہ ہمارے استدلال کی جان قرآن کریم کا سیاق وسباق ہے جس سے اسکی جزئیت متبادر نہیں ہوتی، اسی طرح بہت سی آیتوں میں باری تعالیٰ نے بندوں کو بلفظ آمنوا خطاب فرمایا ہے اور اس کے بعد اعمال صالحہ کا حکم دیا ہے، نماز، روزے اور وضو وغیرہ کی آیات اس کی مثال میں پیش کی جا سکتی ہیں، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اعمال، ایمان کے مفہوم سے خارج ہیں ورنہ آمنوا کہنے کے بعد اعمال کے مستقل تذکرے کی بھی ضرورت نہیں

(۲) قرآن کریم میں اعمال کو ایمان کے ساتھ بطور شرط ذکر کیا گیا ہے، آیتِ کریمہ ملاحظہ ہو

کی غرض سے تشریف لائے تھے اور یہاں دین کی بات پوری طرح سامنے نہ آنے کی وجہ سے اسکی تکمیل نہ ہوسکی، حالانکہ یہ ناممکن ہے اور اس کا تصور بھی درست نہیں ۔

(۶) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ کوئی صحابی ایک سیاہ فام جاریہ کو لیکر آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مجھ پر ایک رقبۂ مومنہ واجب ہے اگر آپ اس جاریہ کو مومن سمجھتے ہوں تو آزاد فرمادیں ، آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جاریہ سے دریافت فرمایا ۔ کیا تو "لا الہ الا اللہ" کی شہادت دیتی ہے؟ جاریہ نے کہا جی ہاں ! آپ نے دریافت فرمایا کیا تو گواہی دیتی ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں ، ؟ جاریہ نے اثبات میں جواب دیا ، آپ نے فرمایا کیا تو حشر ونشر پر ایمان رکھتی ہے ، اس نے اس ارشاد کا جواب بھی اثبات میں دیا ۔ ان سوالات کے بعد آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی سے ارشاد فرمایا کہ اسے آزاد کردو ، یہ مومنہ ہے

اس حدیث میں جاریہ کے مومنہ اور غیر مومنہ ہونے کے سلسلہ میں جن چیزوں کے بارے میں سوال کیا گیا ہے وہ سب اعتقادیات سے متعلق ہیں ، اگر ایمان کے لئے اعمال بھی ضروری ہوتے تو ضرور اس جاریہ سے ان کے بارے میں سوال فرمایا جاتا ، معلوم ہوا کہ اعمال کی شان جزئیت کی نہیں ہے

(۷) قرآن کریم میں ایمان کے قلبی امور میں سے ہونے پر تصریح فرمائی گئی ہے یعنی یہ بتلایا گیا ہے کہ قلب محل ایمان ہے ارشاد ہے

اولئك كتب في قلوبهم	اس لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان
الايمان وايدهم بروح	ثبت کردیا ہے اور ان کو اپنے فیض سے
منه ۲۸پ ۳ر	تقویت دی ہے

ایک اور آیت میں ارشاد ہے

ولما يدخل الايمان في	ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل
قلوبكم ۲۶پ ۱۴ر	نہیں ہوا ہے

معلوم ہوا کہ محل ایمان قلب ہے ، ایک اور آیت میں بات بالکل واضح کردی گئی

قالوا آمنا بافواههم ولم	اپنے منہ سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور ان
تؤمن قلوبهم ۶پ ۱۰ر	کے دل یقین نہیں لائے

اس آیت میں بھی صاف طریقہ پر ایمان کا تعلق دل سے بتلایا گیا ہے ، دوسرے یہ کہ اس آیت میں ایمان سے کفر کا تقابل ڈالا گیا ہے اور سب جانتے ہیں کہ کفر انکار قلب کا نام ہے اس لئے اس کے مقابل کا محل

کی ضد یعنی معاصی کا ایمان کے ساتھ مجتمع ہونا درست نہ ہوتا حالانکہ آیات کریمہ سے اس اطلاق واجتماع کی صحت معلوم ہو رہی ہے ۔ اور اسی اجتماع معاصی کا نتیجہ ہے کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مومنین کو توبہ کا حکم فرمایا گیا ہے ارشاد ہے

یا ایہا الذین آمنوا توبوا الی	اے ایمان والو ! تم اللہ کے آگے سچی
اللہ توبۃ نصوحًا ﴿پ ۲۸ ر ۲۰﴾	توبہ کرو
اور۔ توبوا الی اللہ جمیعًا ایّہ	مسلمانو ! تم سب اللہ کے سامنے توبہ
المومنون ﴿پ ۱۸ ر ۱۰﴾	کرو

یہ توبہ کا ایمان کے ساتھ ذکر فرمانا بتلا رہا ہے کہ ایمان معصیت کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے اس لئے کہ معصیت کے بغیر توبہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ معاصی ضد نہیں ہیں اور نہ اعمال صالحہ جزء ایمان ہیں

(۴) اس سلسلہ میں ایک نہایت اہم بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں دعوت ایمان بہ لفظ "آمنوا" دی گئی ہے اور اہل عرب اس لفظ کو صرف تصدیق ہی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور اب تک یہ ثابت نہیں ہے کہ اسے تصدیق کے علاوہ بھی کسی اور معنی میں استعمال کیا گیا ہو ، اور یہ ناممکن ہے کہ ایمان جیسا معروف اور کثیر الاستعمال لفظ کسی دوسرے معنی میں منقول یا مستعمل ہو اور اہل لغت اسکا ذکر نہ کریں

(۵) اس اثبات کے لئے کہ ایمان کی حقیقت میں اعمال داخل نہیں یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ جب جبریل علیہ السلام نے آکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے بارے میں سوالات کئے تو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تصدیق و اعتقاد سے متعلق امور کا ذکر فرمایا ، ارشاد ہے

الایمان ان تؤمن باللہ وملائکتہ	ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر اور اسکے ملائکہ پر اور اسکے دیدار پر
وبلقائہ ورسلہ وتؤمن	اور اسکے رسولوں پر اور مرنے کے بعد اٹھائے جانے کے عقیدہ
بالبعث بعد الموت (بخاری کتاب الایمان باب سوال جبریل)	پر ایمان لاؤ۔

حدیث شریف میں ہے کہ اس ارشاد کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ جبریل امین تھے اور لوگوں کو دین کی تعلیم دینے کیلئے آئے تھے ، اب اگر ایمان کے مفہوم میں تصدیق کے علاوہ اور بھی اجزاء شامل ہیں تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ معاذ اللہ حقیقتِ ایمان کے بیان میں آپ سے کچھ کوتاہی ہو گئی کیونکہ آپ نے صرف اعتقادیات کا ذکر فرمایا اور اعمال کو قطعًا ترک فرما دیا ۔ دوسری بات یہ کہ اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو حضرت جبریل علیہ السلام کی تشریف آوری کا مقصد پورا نہیں ہوتا کیونکہ وہ دین کی تعلیم

پوچھا، ماموں ! اس مدعی نبوت انسان کے بارے میں کیا خیال ہے، یہ شاعر ہے، ساحر ہے، کاہن ہے، آخر کیا ہے ؟ ابوجہل نے ہر بات کی تردید کی، اور کہا نہ یہ جادوگر ہے نہ اس فن سے واقف ہے، نہ اس کا کلام ہی شاعرانہ ہے، شاعری اور کہانت سے تو خود میں واقف ہوں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ماموں پھر قبول کرنے میں کیا تردد ہے، ابوجہل جواب دیتا ہے کہ ساری خوبیاں بنو ہاشم ہی میں کیوں سمٹ کر چلی جائیں، غرض کفار جب آپس میں گفتگو کرتے تو آپ کے ساحر یا شاعر ہونے کی تردید کرتے اور کہتے کہ یہ کلام سحر ادی ہے

ایک بار حج کے ایام میں ابوجہل نے لوگوں کو جمع کیا اور پوچھا کہ حج کے لئے باہر سے لوگ مکہ آئیں گے تو آپ کے بارے میں ضرور پوچھیں گے، تم کیا جواب دو گے ؟ کفار مکہ میں سے کسی نے کہا شاعر کہیں گے کسی نے کہا ساحر کہیں گے، کسی نے کاہن کہا اور کسی نے دیوانہ ! ابوجہل نے کہا کہ یہ باتیں چلنے والی نہیں ہیں۔ لیکن پھر غور و فکر کے بعد جب کچھ نہ سمجھ میں آیا تو یہی طے ہوا کہ کافر کہنا

اس معرفت اور نجی مجالس میں اعتراف کے باعث ان لوگوں کے کفر کو کفر معاندہ کہا گیا ہے، کفر لغوی اعتبار سے تو ایمان کا مقابل نہیں بلکہ شکر کا مقابل ہے، لیکن شرعی معنی کے اعتبار سے کفر کی چار قسمیں کی گئی ہیں۔ کفر انکار، کفر جحود، کفر معاندہ، کفر نفاق، کفر انکار کا مطلب یہ ہے کہ انسان دل اور زبان دونوں سے انکار کرے اور واقعۃً دوسرے کو برحق نہ سمجھتا ہو، کفر جحود یہ ہے کہ اسے معرفت حق حاصل ہو لیکن زبان سے اس کا اقرار نہ کرے، جیسے ابلیس کا کفر ہے، تیسرا درجہ کفر معاندہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ معرفت قلب بھی حاصل ہے، اقرار بھی ہے لیکن شریعت میں داخل ہونے سے انکار ہے، اس زمرہ میں وہ تمام لوگ داخل ہیں جن کے بارے میں

یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم ۔ پ ۲	وہ لوگ رسول اللہ کو ایسا پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں
فلما جاءھم ما عرفوا کفروا بہ ۔ پ ۱	پھر جب وہ چیز آپہنچی جس کو وہ پہچانتے ہیں تو اسی کا انکار کر بیٹھے

کا نزول ہوا ہے اور آخری درجہ کفر نفاق ہے کہ زبان سے اقرار کرے اور دل میں کفر ہی کفر ہو

الحاصل پیشکردہ آیات و احادیث کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اعمال، ایمان کا جز نہیں اب زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آیات قرآن تو واقعۃً یہی بتلا رہی ہیں کہ اعمال ایمان کا جز نہیں لیکن جگہ جگہ احادیث میں اعمال پر ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے جس سے اعمال کی جزئیت معلوم ہو رہی

بھی قلب ہی ہونا چاہیئے، اور جب محل ایمان قلب ہے تو ظاہر ہے کہ ایمان کی حقیقت صرف تصدیق ہی ہوسکتی ہے، اعمال اس میں کسی صورت داخل نہیں ہوسکتے

یہاں یہ اشکال وارد کیا گیا ہے کہ صرف اس بات کے اثبات سے کہ محل ایمان قلب ہے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ تصدیق ہی حقیقتِ ایمان ہوسکتی ہے، اس لئے کہ قلب تو محل معرفت بھی ہے، اور اس دلیل کی رو سے ایمان معرفت کا نام بھی رکھا جاسکتا ہے جیسا کہ یہ مسلک جہم بن صفوان کا ہے

لیکن یہ اعتراض دو وجہوں سے ناقابل تسلیم ہے، ایک تو یہ کہ اہل عرب ایمان کو تصدیق ہی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اس لئے قرآن کریم میں جہاں بھی بہ لفظ آمنوا خطاب کیا گیا ہے اس سے مراد تصدیق ہی ہوسکتی ہے، اسی وجہ سے اس لفظ کو کسی دوسرے میں استعمال کرنے کے لئے دلیل یا قرینہ کا ہونا ضروری ہے اور بغیر قرینہ و دلیل اسے کبھی دوسرے معنی میں استعمال کرنا لغت عرب میں تصرف ہے جو بہر صورت غلط ہے اور اس طرح کتب لغت سے بھی اعتماد اٹھ جاتا ہے اور ہر ہر لفظ کو خاطرخواہ معنی میں استعمال کرنے کی راہ کھلتی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب، فرعون، ابوطالب، ابولہب وغیرہم بھی انبیاء کرام علیہم السلام کی صداقت کا عرفان اور ان کی نبوت کی معرفت رکھتے تھے، ان لوگوں کو معرفت تامہ حاصل تھی، ابوطالب نے تو اشعار میں آپ کی صداقت و امانت کا اعتراف بھی کیا ہے

ودعوتنی و زعمت انك صادق	وصدقت فیه وکنت ثم امینا
وعرفت دینك لا محالة انه	من خیر ادیان البریة دینا
لولا الملامة اوحذار مسبة	لوجدتنی سمحًا بذاك مبینا

ان اشعار میں پوری دیانت کے ساتھ اعتراف ہے، اسی امید پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں ابوطالب سے فرمایا

یاعم قل کلمة احاج لك بها	چچا جان! کوئی ایسی بات زبان سے ادا کردیجئے
عند الله	جسے میں اللہ کے سامنے بطور حجت پیش کرسکوں

اس وقت سرہانے بیٹھے ہوئے کفار نے فوراً پیش بندی کی اور کہا

اترغب عن ملة عبد المطلب	کیا آپ عبدالمطلب کی ملت سے اعراض کررہے ہیں

اس پر ابوطالب نے کہا

اختورت النار علی العار	میں نے عار کو نار (آگ) پر ترجیح دی

ابوجہل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ماموں ہے، اتفاق سے ایک دن ملاقات ہوگئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

(۱۔ نسائی کتاب الجنائز ص۲۱۲۔ ۲۔ ایضاً)

کا قول کیا جائے۔

ایمان میں کمی زیادتی کا بیان | امام بخاری علیہ الرحمہ نے جس انداز سے مسئلہ شروع فرمایا ہے اس سے نتیجہ میں یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ ایمان تین چیزوں سے مرکب ہے، اعتقاد قلبی، قول لسانی اور افعال جوارح ۔ کیونکہ جملۂ وھو قول وفعل میں قول وفعل دونوں میں تعمیم ہو سکتی ہے، یا تو قول کو قول لسانی اور قول قلبی دونوں پر عام کر دیا جائے گو عرف عام میں قول کا لفظ صرف قول لسانی ہی پر بولا جاتا ہے لیکن اس کو بایں معنی قول قلبی پر بھی عام کیا جا سکتا ہے کہ دل میں تصدیق کا پیدا ہو جانا ایمان نہیں ہے بلکہ پیدا کرنا ایمان ہے اور جب قول، دل اور زبان دونوں پر عام ہو گیا تو فعل سے مراد فعل جوارح ہو ہی جائے گا۔ ورنہ اگر قول کو صرف قول لسانی پر محدود کر دیا جائے تو لفظ فعل میں تعمیم کر دی جائے گی جو فعل قلبی اور فعل جوارح پر عام ہو جائے گا

اور بعض حضرات نے کہا کہ تصدیق واعتقاد کا مسئلہ تو اہل فن کے نزدیک مسلم تھا، اختلاف صرف زبان وجوارح کے سلسلہ میں تھا اس لئے امام بخاری علیہ الرحمہ نے ادھر ہی توجہ مبذول فرمائی اور جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ ایمان میں تین چیزیں داخل ہیں تو اس کے نتیجہ میں ایمان میں کمی زیادتی ممکن ہو گئی، یہ کمی اور بیشی بہ ظاہر امام بخاری علیہ الرحمۃ کی قائم کردہ ترتیب کے مطابق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اجزاء کے اعتبار سے ہے یعنی چونکہ ایمان ایک ذی اجزاء چیز ہے اور تین چیزوں سے مرکب ہے اس لئے ضرور کمی، زیادتی کی قابلیت ہونی چاہئے اور امام بخاری علیہ الرحمہ کے دعوے کے مطابق سلف کا بھی مذہب یہی ہے کیونکہ امام بخاری علیہ الرحمہ نے تمام اساتذہ سے "یزید وینقص" ہی نقل کیا ہے، اور اگر اس سلسلہ میں کچھ اختلاف نظر آتا ہے تو وہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، کیونکہ صرف امام ہی کی طرف "لا یزید ولا ینقص" کی نسبت کی گئی ہے اور جمہور "یزید وینقص" کے قائل ہیں، گویا امام بساطت ایمان کے قائل ہیں اور جمہور ترکیب کے۔ اس لئے بہ ظاہر تردید امام اعظم علیہ الرحمہ ہی کی معلوم ہوتی ہے

لیکن ان قائلین تردید نے اس پر غور نہیں کیا کہ امام اعظم علیہ الرحمۃ کا "لا یزید ولا ینقص" جمہور کے "یزید وینقص" سے متعارض بھی ہے یا نہیں، اگر یہ حضرات اس حقیقت کو سمجھ لیتے تو امام علیہ الرحمۃ کو ہدف بنانے کی نوبت نہ آتی، لیکن کیا کیا جائے کہ ہوتا ہی ایسا آیا ہے

اسلئے اصل تو یہ ہے کہ اول تو امام اعظم علیہ الرحمہ سے "لا یزید ولا ینقص" کا ثبوت ہی دشوار ہے کیونکہ جن تصانیف پر اعتماد کر کے اس قول کی نسبت امام علیہ الرحمہ کی طرف کی گئی ہے تحقیق کی روشنی میں امام علیہ الرحمہ کی جانب غلط ہے، مثلاً فقہ اکبر، امام اعظم علیہ الرحمہ کی طرف منسوب ہے لیکن سچ یہ ہے

ہے ۔لیکن اتنی بات ہے کہ اعمال پر اطلاق ایمان کے یہی معنی معین نہیں ہیں کہ اعمال جزء ایمان ہیں بلکہ اس کے اور بھی معنی ہو سکتے ہیں اور خصوصاً جبکہ آیات قرآنیہ اعمال کے ایمان سے خارج ہونیکا پتہ دیتی ہیں ، اس لئے احادیث میں تاویل ناگزیر ہے اور تاویل ہی نہیں بلکہ احادیث کو آیات کی شرح کہا جا سکتا ہے بلکہ قرآن کریم کی جن باتوں میں توضیح کی ضرورت ہوتی ہے احادیث شریفہ میں انہیں بیان کر دیا جاتا ہے ، مثلاً زیر بحث مسئلہ میں جب آیات کریمہ سے یہ معلوم ہوا کہ اعمال ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں تو امکان تھا کہ کج باطن حضرات اس سے اپنی بے عملی کے لئے استدلال کریں ، اس بے عملی کے سدباب کے لئے احادیث میں اعمال کی اہمیت کو واضح کر دیا گیا ۔ اور انہیں ایمان بتلا دیا گیا ۔اس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ وہ جزء ایمان ہیں

بلکہ اطلاق میں توسع ہے ، ایمان سے اعمال کا بہت قریب کا تعلق ہے ، ایمان میں انشراح انبساط قوت اور قرب وغیرہ سب اعمال سے متعلق ہے ، اور متعلق شے پر شے کا اطلاق کر دیا جاتا ہے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما ہیں کہ ضمام بن ثعلبہ اونٹ پر سوار ہو کر آئے ، احادیث میں آتا ہے کہ ضمام نے مسجد میں اونٹ بٹھا دیا ، حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں

فاناخه فی المسجد ثم عقله	پس انہوں نے مسجد میں اونٹ کو بٹھا دیا
(ابوداود جلد اول صفحہ ۶۹)	پھر باندھ دیا

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ضمام اونٹ لیکر مسجد میں آگئے ، بلکہ مسجد سے باہر چہار دیواری میں جو مسجد ہی سے متعلق تھی اونٹ بٹھا دیا جیسا کہ دوسری روایت میں آتا ہے

فاناخ بعیره عند باب	پس انہوں نے اپنے اونٹ کو مسجد کے
المسجد ثم عقله ثم دخل	دروازہ پر بٹھا دیا پھر اس کو باندھ دیا پھر
المسجد (ایضاً منہ)	مسجد میں داخل ہوئے

ان الفاظ سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے لیکن چونکہ روایت کے پہلے الفاظ میں مسجد ہی کا لفظ آیا تھا اس لئے امام مالک رحمہ اللہ نے اسی سے استدلال کر کے فرمایا کہ اونٹ کی مینگنی اور بول پاک ہے پھر جب اطلاق میں توسع ہے تو اعمال پر ایمان کا اطلاق کرنے سے جزئیت کا تعین نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اعمال پر ایمان کا اطلاق از قبیل اطلاق المبدء علی الاثر ہے ، اور یہاں ایمان مبدء ہے اور عمل اثر مبدأ کی حیثیت میں ہے

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام اعظم علیہ الرحمہ کا قرآن کریم کو اصل قرار دے کر احادیث شریفہ کو اس پر منطبق کرنا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ صرف احادیث میں اعمال پر ایمان کا اطلاق دیکھکر ان کی جزئیت

زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایمان کے دو درجہ ہیں ایک درجہ وہ ہے جو انسان کو جہنم میں داخل ہونے، سے مانع رہے، اور ایک درجہ وہ ہے جو جنت میں جانے کا سبب بنے، وہ ایمان کہ جس کی بنا پر صرف جنت مل سکتی ہے، تصدیق قلبی سے عبارت ہے۔ اور جو دخول نار سے مانع رہے اس کے لئے اعمال کی بھی ضرورت ہے، جس کے پاس طاعات کا ذخیرہ ہوگا وہ جہنم سے محفوظ رہے گا اور جس کے پاس اعمال نہیں اسے خداوند قدوس معاف بھی فرما سکتے ہیں اور سزا بھی دے سکتے ہیں

محدث کی نظر اس ایمان پر ہوتی ہے جو انسان کے لئے دخول نار سے مانع ہو اور ہمیشہ کے لئے اس کو جنت کا مستحق بنادے اور فقیہ و متکلم کی نظر اس ایمان پر ہوتی ہے جو انسان کو صرف جنت کا استحقاق پیدا کردے خواہ وہ ابتداءً ہو یا سزا کے بعد۔

اس لئے ان دونوں کا نقطۂ نگاہ اور موضوع بحث ہی الگ الگ ہے گو دونوں اس پر بھی متفق ہیں کہ صرف تصدیق بھی انسان کو دخول جنت کے لئے کافی ہے خواہ اس کے ساتھ کتنے بھی معاصی ہوں۔ اب اگر یہ پوچھا جائے کہ وہ ایمان جس پر مدار نجات ہے گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کے جواب میں یہ کمی بیشی کے قائلین بھی یہی کہیں گے کہ وہ ایمان جو مدار نجات ہے کمی بیشی قبول نہیں کرتا، ایمان کا وہ درجہ جو انسان کو کفر سے بچا کر جنت کا مستحق بنادے وہ تصدیق کا ایک آخری درجہ ہے جس میں اگر ذرا اور ضعف آجائے تو کفر آجاتا ہے جس کے بارے میں سابق صفحات میں یہ گذر چکا ہے کہ وہ تصدیق کا اس قدر دھندلا نقش ہے جسے پیغمبر علیہ السلام کی نگاہ بھی نہ دیکھ سکی، یہ درجۂ ایمان کی کو واقعی قبول نہیں کرتا، لیکن زیادتی کے قبول کرنے میں بظاہر کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی، لیکن ذرا غور کرنے کے بعد یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قبول زیادت کا یہ مطلب ہے کہ جبتک اس زیادتی کو شامل نہ کریں گے نجات نہ ہو سکے گی گویا مدار نجات صرف وہ دھندلا نقش ہے جس کو خداوند قدوس جانتے ہیں، مغفرت کے لئے جوارح پر اعمال کی روشنی اور چمک درکار ہے ——— لایزید ولا ینقص ——— کی یہ شرح کتاب عقیدۃ الطحاوی کی شرح قونوی میں منقول ہے جو ایک حنفی المذہب کی تالیف ہے،

اب ان دونوں باتوں کا نقطۂ نظر الگ الگ ہو گیا جمہور جس سلسلہ میں "یزید و ینقص" کہہ رہے ہیں امام رحمۃ اللہ اس کے منکر نہیں اور امام نے جو حقیقت بیان فرمائی ہے وہ جمہور کے نزدیک بھی مسلم ہے یعنی اس پر سب کا اتفاق ہے کہ تارک اعمال فاسق ہے کافر نہیں اور جب کافر نہیں ہے تو ضرور کسی نہ کسی وقت جنت میں داخل ہو جائے گا، اس تفصیل کے بعد یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ پہلے مقابلہ ڈالنا اور پھر کسی بھی ایک کو نشانہ بنا لینا نہایت بے سمجھی کی بات ہے

کہ یہ امام کے تلمیذ ابو مطیع البلخی کی تصنیف ہے جو فقہاء کی نظر میں بلند مرتبت سہی لیکن محدثین کی نگاہ میں کمزور ہیں۔ اسی طرح العالم والمتعلم، الوصیۃ اور وسطین امام اعظم علیہ الرحمۃ کی طرف منسوب ہیں، لیکن صحیح یہ ہے کہ امام رحمہ اللہ تک ان کی نسبت کی صحت میں کلام ہے

اور حضرت علامہ کشمیری علیہ الرحمہ کی تحقیق کے مطابق امام اعظم علیہ الرحمۃ کے مذہب کا رخ ہی یہ نہیں ہے کہ جس کو امام بخاری رحمہ اللہ سمجھ رہے ہیں، نیز ابراہیم بن یوسف تلمیذ امام ابو یوسف اور احمد بن عمران کا قول طبقات الحنفیہ میں موجود ہے کہ وہ ایمان میں کمی بیشی کے قائل تھے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ حافظ ابو عمرو بن عبد البر مالکی نے شرح موطا میں امام حماد علیہ الرحمہ کی طرف اس کی نسبت کی ہے جو امام اعظم رحمہ اللہ کے استاد ہیں اور حافظ ابو عمرو رحمہ اللہ نقل میں ثقہ بھی ہیں اس لئے اس نسبت کو تسلیم کرنا بھی ناگزیر ہے، لیکن اس سلسلہ میں امام طحاوی رحمہ اللہ کی کتاب عقیدۃ الطحاوی سب سے زیادہ بہتر کتاب ہے انہوں نے آغاز کتاب ہی میں فرمایا ہے کہ وہ اس کتاب میں امام اعظم علیہ الرحمۃ کے عقائد لکھیں گے، امام طحاوی علیہ الرحمہ نے اس کتاب میں تحریر فرمایا ہے کہ ایمان میں سب برابر ہیں، ایمان میں کمی و زیادتی کے اعتبار سے کوئی تفاوت نہیں، تفاوت صرف تقوی، اتباع سنت، اجتناب عن المعاصی وغیرہ میں ہو سکتا ہے بہر کیف صرف حافظ ابو عمرو پر اعتماد کرتے ہوئے ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ امام اعظم علیہ الرحمۃ ایمان میں زیادت ونقصان کا انکار کرتے ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ اس قول کے معنی کی تحقیق کی جائے، تحقیق سے ثابت ہے کہ امام رحمہ اللہ کے عدم زیادت ونقصان اور جمہور کے قول زیادت ونقصان میں کوئی تفاوت نہیں ہے اور اختلاف دراصل نقطۂ نظر میں ہے "یزید وینقص" کا مدار اعمال پر ہے یعنی اعمال کو ایمان کا جز قرار دیا، اور چونکہ اعمال میں کمی بیشی ہوتی ہے، اس لئے اعمال کی وساطت سے ایمان میں کمی بیشی کا امکان ہو گیا

لیکن جمہور اس بارے میں متفق ہیں کہ وہ شخص جس کے پاس کوئی عمل نہ ہو صرف تصدیق و اقرار ہو تو ایسا شخص فاسق ہے کافر نہیں اور اس پر اتفاق ہے کہ یہ شخص ضرور کبھی نہ کبھی جنت میں جائیگا، بخاری شریف ہی کی روایت میں ہے کہ ایک شخص کے نامۂ اعمال کا جب وزن ہونے لگا تو وہ منتہائے نظر تک سیاہ تھا، ایک بھی عمل خیر نہ تھا، اور یہ شخص اپنی جگہ مغفرت سے بالکل مایوس ہے، اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو نے زندگی میں کوئی عمل خیر کیا ہے؟ عرض کرتا ہے کہ عمر معاصی میں گذری ہے میرے پاس کوئی عمل خیر نہیں ہے، لیکن اللہ تعالے فرمائیں گے ہمارے یہاں ظلم نہیں ہے، اور پھر ایک طرف گناہوں کے دفاتر رکھے جائیں گے اور دوسری طرف میزان میں کاغذ رکھا جائیگا جس پر صرف کلمۂ طیبہ لکھا ہوگا، اس کاغذ کے پرزہ کے رکھتے ہی وہ پلا نیچے ہو جائے گی اور وہ دفاتر اوپر اٹھ جائیں گے[1]، اس بطاقہ کا وزن عالم الغیب والشہادۃ ہی جان سکتے ہیں

[1] ترمذی جلد ثانی ص۰۰

باطلہ کے ساتھ شمار کیا جا سکتا ہے

بالکل اسی طرح ایمان کا معاملہ ہے، ایک طرف معتزلہ وخوارج ہیں اور دوسری جانب مرجیہ وکرامیہ اہل سنت درمیان میں ہیں، لیکن ان میں کوئی مرجیہ سے قریب ہے اور کوئی معتزلہ سے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ یہی مثال پیش فرمایا کرتے تھے،

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ کے ترجمہ کا رخ امام اعظم رحمۃ اللہ کی جانب نہیں ہے بلکہ اب امام براہ راست مرجیہ سے مخاطب ہیں اور پوری کتاب میں دو ہی فرقوں سے معاملہ ہے، ایک معتزلہ اور دوسرے مرجیہ۔ اس تالیف میں مرجیہ سے امام کا معاملہ بہت زیادہ ہے کیونکہ مرجیہ میں بے دینی ہے اور خوارج میں بے دینی نہیں ہے بلکہ دین کے معاملہ میں تشدد ہے، لیکن یہ تشدد حماقت کے درجہ تک ہے، اس لئے پہلے امام بخاری علیہ الرحمہ مرجیہ کی کان گوشمالی کرنا چاہتے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں امام بخاری رحمۃ اللہ اہل حق کے بھی خلاف کہیں گے لیکن اسے مقصود بنا کر نہیں کہتے بلکہ ضمن میں کہتے جاتے ہیں، سمجھنے والا سمجھ لیتا ہے، کہ یہاں امام رحمۃ اللہ کیا چاہتے ہیں۔

لیکن اگر کوئی شخص ان تمام تفصیلات سے قطع نظر کر کے یہی کہتا ہے کہ امام نے یہاں امام اعظمؒ ہی کا رخ کیا ہے تو سب سے پہلا سوال جو امام بخاری رحمۃ اللہ سے کیا جائیگا یہ ہے کہ معاملہ ایمانیات کا ہے اور آپ اس سلسلہ میں امام اعظمؒ سے الجھ رہے ہیں اور آپ نے جو ترجمہ قائم فرمایا ہے وہ بنی الاسلام علی خمس ہے، گویا دعویٰ ایمان کی کمی وبیشی کا ہے اور دلائل بیان کرنے شروع کئے تو اسلام کی کمی زیادتی کا اثبات کیا، کہیں تقوے کی کمی بیشی بیان کی کہیں محبت کا ذکر کیا، ہم بھی اسلام کے اندر اعمال کو داخل مانتے ہیں، تقوے اور محبت کی کمی بیشی سے ہمیں بھی انکار نہیں۔ لیکن ایمان کی کمی بیشی جس کا آپنے دعویٰ کیا تھا اب تک بے دلیل ہے، اور محتاج ثبوت، ایمان واسلام کا مسئلہ ان شاء اللہ اگلے ابواب میں مفصل آرہا ہے

امام بخاری علیہ الرحمۃ نے جن چیزوں سے ایمان کے اندر کمی، زیادتی کے بارے میں استدلال کیا ہے ان میں سب سے پہلی آیت لیزدادوا ایمانا مع ایمانھم ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ایمان میں زیادتی ہو سکتی ہے، رہا کمی کا معاملہ تو جو چیز زیادتی کو قبول کر سکتی ہے وہ کمی کی بھی قابلیت رکھتی ہے مع ایمانھم کی روشنی میں یہ ماننا پڑیگا کہ ایمان پہلے موجود تھا اور اس میں یہ بعد میں آنے والی زیادتی شامل نہ تھی نیز اس مع ایمانھم سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ ان لوگوں کو ایمان بتمامہ حاصل تھا اسلئے کہ اگر ان تمام چیزوں کو جزئیت کے درجہ میں مانا جائے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ایمان اس سے قبل

حقیقت یہ ہے کہ ایمان نقطۂ نظر میں اختلاف کے باعث مرکب بھی ہے اور بسیط بھی، لیکن مرکب ماننا محدث کا وظیفہ ہے اور بسیط کہنا فقیہ و متکلم کا،

اب اگر کوئی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو صرف اس لا یزید ولا ینقص ۔ کی بنا پر جبریہ کہنے لگے تو اگر اتحاد لفظی کے باعث امام رحمہ اللہ کو مرجیہ کہا جا سکتا ہے تو تمام محدثین، حنابلہ، موالک اور خود امام، بخاری رحمہم اللہ کو معتزلہ اور خوارج کی صف میں لے آنا ہوگا کیونکہ اتحاد لفظی کا وہ رشتہ یہاں بھی پایا جاتا ہے اور اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ محدثین اور معتزلہ کے درمیان تو بہت بڑا فرق ہے تو ہمیں عرض کرنے دیجئے کہ فرق امام اور مرجیہ کے درمیان بھی ہے

اور اس فرق باطلہ سے لفظی اتحاد، اور اہل حق کے درمیان اس اختلاف تعبیر کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے ہر امام کے دور پر تاریخی نظر ڈال لینی چاہیئے کیونکہ ہر امام نے اپنے عصر کی رعایت سے وہی بات کہی ہے جو اس دور کی گمراہیوں کا علاج بن سکے اور یہی مناظرہ کا اصول ہے کہ مقابل سے کسی بھی جزو میں اتحاد و اتفاق نہ کیا جائے اسی وجہ سے اکابر کے اقوال میں اختلاف ملتا ہے گو حقیقت سب کے نزدیک ایک ہے

لیکن ہم نے حقیقت کو نظر انداز کر دیا اور زوائد میں الجھ گئے، جیسا کہ جبریہ و قدریہ ہیں، قدریہ کہتے ہیں کہ تقدیر کچھ نہیں ہے بلکہ انسان اپنے افعال کا خود خالق ہے، دوسرا فریق کہتا ہے کہ انسان مجبور محض ہے سب کچھ باری تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، دونوں کے پاس قرآن وحدیث کی روشنی میں کچھ دلائل ہیں لیکن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل پیغمبر علیہ السلام کی تعلیمات کی روشنی میں یہ ہے کہ جبر و قدر دونوں کو اپنے اپنے درجہ میں مانا جائے، خداوند قدوس خالق افعال ہیں اور بندہ کاسب ہے، اور کسب کے لئے اختیار ضروری ہے، کچھ اختیار دے کر بندہ کو جبر محض سے نکال لیا اور دوسری طرف یہ کہکر کہ بندہ کسی چیز کا خالق نہیں ہے اسے بالکل ہی مختار نہیں قرار دیا ۔ خداوند قدوس نے انسان کو اختیار عطا فرمایا ہے انسان اس اختیار کے استعمال میں مجبور ہے

— الانسان مجبور فی اختیاره ومختار فی افعاله —

خداوند قدوس نے ہمارے اندر ارادہ رکھدیا ہے، ہم مجبور ہیں کہ جب کوئی کام کریں تو اس کے بارے میں سوچیں، اسباب کی فراہمی کے لئے تگ و دو کریں، گویا ہم مختار بھی ہیں اور مضطر بھی ۔

وانما لنا منّا علی اختیارنا ولکنّها نحو القدر یؤول

اب ایک جانب قدریہ ہیں اور دوسری جانب جبریہ اور اہل سنت بین بین ہیں، لیکن اہل سنت میں کوئی ان جبریہ سے قریب ہے اور کوئی قدریہ سے، بس اسی قرب و بعد کی مناسبت سے اہل سنت کو ان فرق

ایکم زادته هذه ایمانا ۔ یعنی جب کوئی نئی آیت یا سورت نازل ہوتی ہے تو منافقین بہ طور طعن کہتے ہیں۔ ایکم زادته هذه ایمانا ۔ بتلاؤ کہ تم میں سے کون ایسا ہے کہ اس کے ایمان میں اس آیت نے ترقی پیدا کی ہو، اس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ایمان ان حضرات کی نظر میں قابل زیادت ونقصان ہے، یہ قول اگرچہ منافقین کا ہے لیکن خداوند قدوس نے نقل فرمایا ہے اور جواب میں ارشاد ہے

اما الذین آمنوا فزادتهم	سو جو لوگ ایمان دار ہیں اس سورت نے ان
ایمانا ۱۱ پ ۵	کے ایمان میں ترقی دی ہے

جب ان منافقین کے پاس ایمان ہی نہیں تو زیادتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ نزول آیات سے ان کا کفر بڑھتا ہے کیونکہ یہ احکام خداوندی کے ساتھ استہزاء و مذاق کرتے ہیں ان کے لئے زادتهم رجسا الیٰ رجسهم ہے لیکن جن لوگوں کے قلوب میں ایمان ہے ان لوگوں کا ایمان اور جذبہ عمل ہر آیت کے بعد بڑھتا ہے۔ گویا ایمان امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک اس آیت کی روشنی میں قابل زیادت ہے اور جو چیز قابل زیادت ہوتی ہے وہ قابل نقصان بھی ہونی چاہیئے۔

لیکن اس سے امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد بجبر کے مقابل ثابت ہو سکتا ہے ورنہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اجمالاً وہ ماجاء بہ الرسول کی تصدیق کر چکے ہیں، اب جو نئے احکام آتے جاتے ہیں تصدیق ان سے متعلق ہوتی جاتی ہے اس طرح ایمان ترقی کر رہا ہے اور مومن بہ کے عدد بڑھ رہے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک بھی مسلم ہے

یہاں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ فاخشوهم سے پہلے چار آیات مصنف علیہ الرحمۃ نے ایک ہی قول کے تحت ذکر کی تھیں اور اس آیت اور دوسری آیت کو مستقل عنوان قوله سے لا رہے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں طعنہ کا جواب ہے اور یہ نقل بہ طور حکایت ہے۔ اس کی شان اور آیات سے مختلف ہے اسی طرح اگلی آیت فاخشوهم دوسرے کا قول ہے، نیز تیسری آیت فزادتهم ایمانا، خداوند قدوس کی جانب سے مسلمانوں کے معاملہ کی حکایت ہے

۔ وما زادهم الا ایمانا وتسلیما ۔ غزوۂ خندق میں مسلمانوں پر چاروں طرف سے یورش تھی، بارہ ہزار، اور بقول بعض چوبیس ہزار کی تعداد میں پورے ساز و سامان کے ساتھ محاصرہ کیا گیا تھا اس وقت مدینہ میں مسلمان مشکل سے چار ہزار ہوں گے اور ان چار ہزار میں وہ بھی شامل ہیں جنہوں نے بہانے نکال کر عملی کمزوری دکھلائی خواہ منشا نفاق ہو یا واقعۃً یہ کمزوری ہی ہو، اسلئے مقابلہ پر صرف دو ہزار کی جمعیت تھی اس کا تقاضا تھا کہ ان کے اندر خوف ہوتا لیکن ایمان وتسلیم میں اضافہ ہوا

کامل نہ تھا، اب اس جزء کے اضافہ کے بعد ایمان کامل ہوا ہے، اس لئے جزئیت کے درجہ میں تسلیم نہیں کیا جاسکتا اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان دلائل سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مدعا صرف مرجیہ کے مقابل ثابت ہو رہا ہے کہ ایمان موجود تھا اور اب اس میں ایک اور چیز کی زیادتی ہو گئی

دوسری آیت زدناھم ھدی ـ بھی اسی شان کی ہے، ہدایت یا عین ایمان ہے یا وہ ایمان میں داخل ہے یا ایمان ہدایت میں داخل ہے، دونوں لازم و ملزوم ہیں کیونکہ ہدایت سے مراد وصل الی المطلوب ہے، زیادتی ہدایت کے سلسلہ میں دوسری آیت ملاحظہ ہو

یزید اللہ الذین اھتدوا ھدی ـ پ ۱۶ ر ۸ ـ اللہ تعالیٰ ہدایت والوں کو ہدایت بڑھاتا ہے

مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ اپنے کسب اور اپنی کوشش سے ہدایت حاصل کرتے ہیں خداوند قدوس کی عادت ہے کہ ایسے لوگوں کو انعام کے طور پر اور ہدایت کی توفیق ارزاں فرماتا ہے جس طرح کفر کے اعمال مزید کفر کے لئے داعیہ پیدا کرتے ہیں اسی طرح ایمان کے اعمال ایمان میں زیادتی کا سبب بن جاتے ہیں ارشاد ہے

ویزداد الذین آمنوا ایمانا ـ پ ۲۹ ر ۱۵ ـ اور ایمان والوں کا ایمان اور بڑھ جائے

اس طرح کی آیات سے زیادتی کا مسئلہ تو صاف ہو گیا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ زیادتی کن معنی کے اعتبار سے ہے یعنی یہ زیادتی کیف کے اعتبار سے ہے یا کم کے، یا یہ زیادتی اجمال و تفصیل کے اعتبار سے ہے

اگر یہ آیات تکمیل بعثت سے قبل کی ہیں تو اس کے بے تکلف معنی یہ ہیں کہ ضروری احکام یکبارگی نازل نہیں فرمائے گئے تھے بلکہ حسب ضرورت و مصلحت ان کا نزول ہوتا رہا، گویا وہ مومن جس کا ایمان اجمال کے درجہ میں صرف ـ آمنوا ـ سے متعلق تھا جب اس کے سامنے ـ اقیموا الصلوۃ ـ کا حکم آیا تو اس کا ایمان زائد ہو گیا، پھر روزہ کا حکم آیا تو ایمان کی تفصیل میں اور زیادتی ہو گئی، تصدیق وہی ہے لیکن متعلقات کی کثرت ہے ـ اس کا حاصل یہ ہے کہ آپ نے جس زیادتی کے بیان کا ارادہ کیا ہے وہ مومن بہ کی زیادتی ہے یہ جواب امام اعظم رحمۃ اللہ سے منقول ہے، دین میں آپ کے مدعا کے موافق کمی بیشی جب ثابت ہوتی کہ الیوم اکملت لکم دینکم کے بعد یہ صورت پیش آئی ہوتی، لیکن تکمیل کے بعد زیادتی کریں تو ابداع ہے اور کمی کریں تو کفر ہے ـ

رہا کیف کا معاملہ تو سب کے نزدیک مسلم ہے کہ عام لوگوں کا ایمان صحابہ، جبریل و میکائیل اور انبیاء کرام جیسا نہیں ہے اس کا انکار نہ جمہور کر سکتے ہیں اور نہ امام اعظم رحمۃ اللہ نے کیا ہے

اس مقولہ سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اعمال ایمان میں موثر ہیں ۔ جزئیت تو بالکل نہیں معلوم ہوتی لیکن امام بخاری رحمہ اللہ کے طاعت ومعصیت کو حذف کردینے سے معنی بالکل بدل گئے حالانکہ مقولہ مطلق کے معنی بالکل واضح تھے کہ طاعت سے نور اور معصیت سے ظلمت پیدا ہوتی ہے ایمان کی ترکیب وبساطت کا اس سے کوئی علاقہ ہی نہیں ۔

والحب فی اللہ والبغض فی اللہ من الایمان امام بخاری رحمہ اللہ جبریہ کی تردید کیلئے ایک اور جملہ کا اضافہ فرما رہے ہیں کہ تم اعمال کو ایمان سے بالکل بے تعلق بتلاتے ہو کہ نہ اطاعت سے ترقی ہوتی ہے نہ معصیت سے ضرر ہوتا ہے جس طرح عمل کرنے والا جنت میں جائیگا اسی طرح غیر عامل بھی ۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اعمال کا معاملہ تو نہایت اہم ہے حب اور بغض بھی اس بارے میں موثر ہیں ، محبت ہو تو اللہ کے لئے ہو کوئی لالچ نہ ہونا چاہیئے ۔ اسی طرح کسی شخص کے ساتھ بغض کا منشا بھی خداوند قدوس کی ذات ہونی چاہیئے

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس مقولہ سے استدلال کیا ہے اور ان کے نزدیک یہ من تبعیض کے لئے ہے اور احناف کے نزدیک یہ ابتدائیہ اور اتصالیہ ہے یعنی یہ ایمان سے متصل ہے جیسے

انت منی بمنزلة ھارون من موسیٰ — میرے لئے تم وہی ہو جو حضرت موسیٰ کے لئے حضرت ہارون تھے

کتب عمر بن عبد العزیز الی عدی بن عدی الخ ۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے گورنر کو ہدایت نامہ بھیجا کہ ایمان کے اندر فرائض ، شرائع ، حدود و سنن ہیں

فرائض جو چیزیں فرض کی گئی ہیں ، اس سے مراد یا تو عقائد و اعمال ہیں ، اس وقت شرائع سے مراد نوافل وغیرہ لیجائیں گی یا فرائض سے مراد مفروض چیزیں ہیں اور شرائع سے مراد اعتقادیات ۔

امام بخاری علیہ الرحمۃ کا مقصد یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ ایمان کے اندر ان تمام چیزوں کو داخل مان رہے ہیں ، اس سے بھی جبریہ ہی کی تردید ہوسکتی ہے کیونکہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں ۔ ان للایمان فرائض ۔ اور ان للایمان فرائض ۔ ان الایمان فرائض سے مختلف ہے ، امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ اس مقولہ میں صرف بیان کیا گیا ہے کہ ایمان کے لئے یہ چیزیں ضروری ہیں اور ان کے نقصان سے ایمان میں نقصان آتا ہے

استکملھا کا مفہوم یہ ہے کہ فرائض ، شرائع ، حدود وغیرہ سب پر پورے طریقہ پر عامل رہا تو تکمیل ہو جائے گی گویا یہ اجزاء مقوم نہیں موثر ہیں کیونکہ یہ نہیں فرمایا کہ اگر اعمال نہ ہوں گے تو ایمان جاتا رہیگا بلکہ

۔ فاخشوھم ۔ بدر صغریٰ کے موقعہ پر کفار کی طرف سے آنیوالوں نے اطلاع دی کہ اس طرف سے لوٹنے کی تیاری ہو رہی ہے یعنی ابوسفیان جو واپس ہو گیا تھا اس کو راستہ ہی میں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اس نے ارادہ کر لیا ہے کہ واپس چلکر بقیۃ السلف مسلمانوں کو ٹھکانے لگا دے ۔ اس اطلاع سے کمزوری پیدا نہیں ہوئی بلکہ فزادھم ایمانا ۔ ان کے یقین و ایمان میں اور اضافہ ہو گیا اور مسلمان ان کی مدافعت کے لئے تیار ہو گئے ۔ جیساکہ ایمان کا تقاضا تھا ، کہ دشمن ایمان پر ڈاکہ ڈالے تو تمہارا فرض ہے ہر حال میں شکست دینے کے لئے مستعد ہو جاؤ ۔

ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ ایمان میں زیادتی ہوتی ہے اور جو چیز زیادتی کو قبول کرتی ہے وہ نقصان کو بھی قبول کرتی ہے ، یعنی جب یوں کہا جائے کہ فلاں کا ایمان زائد ہے تو اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ دوسرے کا ایمان اس کے مقابل کمزور ہے ، لیکن اس کمزوری کی یہ تعبیر نہیں کر سکتے کہ جن چیزوں پر ایمان ضروری ہے ان میں سے بعض پر ایمان ہے بعض پر نہیں ۔ اسلئے کہ یہ کفر ہے اگر جمیع ما جاء بہ الرسول میں سے ایک چیز بھی نکل جائے گی تو کفر ہو جائے گا ، الیوم اکملت لکم دینکم کے بعد نہ کمی کا امکان ہے نہ زیادتی کا ۔ اس لئے اب کمی بیشی طاقت کے اعتبار سے ہو گی ،

ایک شخص بڑی پختگی کے ساتھ اوامر و نواہی پر کاربند ہے اور اسکے پاس اخلاص بھی ہے ، ایسے شخص کا ایمان اس انسان سے قوی ہے جو اتنی سختی سے کاربند نہیں اور اس کے اخلاص میں کمی ہے ایک کے ایمان کا وزن دوسرے کے مقابل بہت زائد ہے ، اسلئے کیف کے اعتبار سے کمی زیادتی ہو سکتی ہے خاصان خدا کا ایمان عامۃ الناس سے کہیں زائد ہوتا ہے ۔

اب کیف کی کمی زیادتی میں تمام حضرات متحد ہو گئے ، اسی کا اشارہ سلف کے قول الایمان یزید بالطاعۃ و ینقص بالمعصیۃ ۔ سے ہوتی ہے جس کو حافظ ابوالقاسم لالکائی نے نقل کیا ہے اور اس سلسلہ میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور دیگر اسلاف کے اسماء گنائے ہیں

اب معنی یہ ہوئے کہ تصدیق معنوی میں اضافہ ہو رہا ہے ۔ یعنی فرمانبرداری سے ایمان بڑھتا ہے اور معاصی سے کمزور ہوتا ہے ، جزئیت کا علاقہ نہیں ہے ، جزئیت و تحلیل کی بحثیں خالص منطقی انداز کی ہیں جو اس مقولہ سے بعد کی ہیں ، اس مقولہ سے جزئیت کا اثبات زبردستی کی بات ہے ، نیز امام بخاری رحمۃ اللہ نے ۔ یزید و ینقص ۔ کو طاعت و معصیت سے الگ ذکر فرمایا ہے جس سے بات بالکل ہی بدل گئی ۔ ـــــــــــــ امام بخاری رحمۃ اللہ کے انداز بیان سے جزئیت ہی بتا رہے ہیں لیکن مقولۂ سلف سے صرف تصدیق باطنی میں کمی زیادتی معلوم ہوتی ہے کیونکہ

قیمتی ہار بیت المال میں داخل کر دیا

اس دور خلافت کے متعلق ان کی بیوی کا بیان ہے کہ اس عرصہ میں انہیں غسل کی ضرورت نہیں ہوئی کیونکہ دن بھر تو قضایا کا فیصلہ فرماتے تھے اور رات کو سربسجود ہو کر خداوند قدوس کے سامنے گریہ وزاری کرتے کہ اے خدائے قادر و قیوم جو ذمہ داری تو نے مجھ پر ڈالی ہے اس کو پورا کرنے کی بھی توفیق ارزاں فرما دے ۔ بنو امیہ نے انہیں زہر دیا ہے کیونکہ انہوں نے ان حضرات کو صراط مستقیم کی دعوت دی تھی ـــــــــ آگے ارشاد فرماتے ہیں

فان اعش فسابینہالکم ۔ اگر میں زندہ رہا تو تمام تفصیلات پیش کرونگا ، تاکہ تم عمل کرسکو ، اور اگر میں مر گیا ، تو مجھے زندگی کی ہوس نہیں ہے ـــــــــ یہاں اشکال یہ ہے کہ حضرت عمر رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کہ "مجھے زندگی کی ہوس نہیں ہے" سے موت کی تمنا معلوم ہو رہی ہے جو مذموم وممنوع ہے ، حدیث صحیح میں ہے کہ تم میں کوئی بھی موت کی تمنا نہ کرے ، اگر وہ نیکوکار ہے تو امید ہے کہ اس کے اعمال صالحہ بڑھیں گے اور اگر بدکار ہے تو ممکن ہے اسے توبہ کی توفیق ہو جائے

اتنی پریشان حالی کے ایام میں بھی کہ جب زندگی وبال جان بن رہی ہو صرف اس دعا کی اجازت ہے کہ اے اللہ اگر میرے لئے زندگی بہتر ہے تو عافیت زندہ رکھ ، ورنہ مجھے ایمان کے ساتھ اٹھا لے ۔ تمنائے موت اسلئے مذموم ہے کہ یہ دنیا مزرعۂ آخرت ہے ، آخرت کے معاملہ میں جس قدر بھی ترقیات ہو سکتی ہیں وہ سب اسی عالم کے اعمال پر موقوف ہیں ۔ آنکھیں بند ہو جائیں تو ترقیات ختم ہو جاتی ہیں روایت میں آتا ہے

اذامات الانسان انقطع عنہ عملہ	جب انسان مر جاتا ہے تو تین چیزوں کے علاوہ
الاعن ثلاثۃ اشیاء (ابوداؤد جلد ۲ ص۴۲)	اس کے تمام اعمال منقطع ہو جاتے ہیں

دراصل حضرت عمر بن عبد العزیز پر عبدیت کا غلبہ ہے اور جب انسان پر عبدیت کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کے سامنے اپنے کمالات نہیں رہتے بلکہ نظر اپنے نقائص پر آجاتی ہے حضرت عمر جانتے ہیں کہ انما العبرۃ بالخواتیم ـــ اور خاتمہ کے متعلق کوئی شخص کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ اس وقت اچھے اچھے ، برے ہو جاتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ برے عمل والے حسن خاتمہ کے باعث آخرت میں فلاح یاب ہو جاتے ہیں خداوند قدوس بے نیاز ہے ، ارشاد ہے

لایسئل عمایفعل ـــ

اسی وجہ سے اہل حق ہمیشہ ترساں ولرزاں رہتے ہیں اور ان کی دعا یہی ہوتی ہے کہ اے اللہ ہمیں اس

یہ فرمارہے ہیں کہ کمال ایمانی ان کے کمال پر موقوف ہے ، اور جس قدر شدت کے ساتھ ان پر عامل ہوگا اسی قدر ایمان میں کمال آئے گا ،

راغب اصفہانی نے تمام اور کمال میں فرق کیا ہے کہ تمام ، ذات ، اور کمال ، صفات کے موقعہ پر استعمال ہوتا ہے اور یہاں کمال کا استعمال کیا گیا ہے معلوم ہوا کہ یہ چیزیں داخل ذات نہیں ۔ اسلئے جو چیز اس مقولہ سے ثابت ہو رہی ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں ،

اس سے صرف مرجیہ کی تردید ہو رہی ہے کہ تم ایمان میں اعمال کو کوئی مقام نہیں دیتے حالانکہ اس کی تاکید و تائید کے سلسلہ میں قرآن کریم ، احادیث شریفہ اور اکابر کے اقوال سب ہی کچھ موجود ہیں

اسی سلسلہ میں امام بخاری رحمۃ اللہ نے حضرت عمر بن عبد العزیز کا یہ مکتوب نقل فرمایا ، حضرت عمر بن عبد العزیز کی خلافت کو ، خلفائے راشدین کی خلافت کا تتمہ قرار دیا گیا ہے ، گو ان کی مدت خلافت بہت ہی کم ہے صرف دو سال چند ماہ ہے ۹۹ھ میں خلیفہ ہوئے اور ۱۰۱ھ میں وفات ہوگئی ، لیکن انہوں نے اس قلیل مدت میں دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیا تھا ، بنو امیہ کے دور خلافت میں جو مظالم ہو رہے تھے ، انکو حضرت عمر ابن عبد العزیز رحمہ اللہ نے ختم کر دیا ، مشہور ہے کہ ان کے دور خلافت میں بھیڑیا اور بکریاں ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے اور بھیڑیا بکری پر حملہ نہیں کر سکتا تھا ، علامہ ابن الجوزی نے اس کی تصریح کی ہے اور لکھا ہے کہ ایک دن چرواہے نے شور کیا ، اس سے اس حرکت کی وجہ دریافت کی گئی تو اس نے کہا معلوم ہوتا ہے خلیفۂ وقت کا انتقال ہو گیا ہے اس لئے کہ بھیڑیے نے بکری پر حملہ کر دیا ، چنانچہ تحقیق کی گئی تو جو وقت بھیڑیے کے بکری پر حملہ کرنے کا تھا وہی وقت خلیفۂ عادل کے وصال کا تھا

حضرت عمر بن عبد العزیز کو خواب میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر قریب دیکھا گیا ہے کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی اس قدر قریب نہ تھے ، دیکھنے والے کو حیرت ہوئی بارگاہ نبوت میں ، عرض کیا کہ انہیں یہ قرب کس طرح حاصل ہوا فرمایا کہ انہوں نے ایسے وقت میں انصاف سے کام لیا جب ظلم کا تسلط تھا اور صدیق و فاروق کے دور میں انصاف باقی تھا ۔

حضرت عمر بن عبد العزیز نے بنو امیہ کی وہ جائیدادیں ضبط کرلیں جو انہوں نے ناجائز طریقہ پر حاصل کرلی تھیں اور وہ اعلیٰ سامان جو انہوں نے حاصل کر لئے تھے بیت المال میں داخل کر دئے گئے ، ایک بار حضرت عمر نے اپنی اہلیہ سے فرمایا کہ تم نے جو یہ قیمتی ہار زیب گلو کر رکھا ہے اسے بیت المال میں داخل کر دو ، اہلیہ نے کہا آپ کو اس سے کیا تعلق ؟ یہ تو مجھکو میرے باپ عبد الملک بن مروان نے دیا ہے حضرت عمر نے فرمایا کہ اگر ہار نہیں داخل کر سکتی ہو تو میرے ساتھ رہنا دشوار ہے وہ ڈر گئیں اور اپنا وہ

(۱ے طبری جلد اول)

یقین ہے مگر طلب بجھانا چاہتا ہوں، علم الیقین سے عین الیقین تک عروج کرنا میرا مقصد ہے

امام بخاری رحمۃ اللہ کا مقصد بھی اسی سے متعلق ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس ارشاد سے معلوم ہو رہا ہے کہ ایمان کے مختلف درجات ہیں۔ وہی اطمینان علم الیقین کے درجہ میں ہے اور وہی اطمینان مشاہدہ کے بعد عین الیقین ہو جاتا ہے اور اگر اپنی ذات پر تجربہ ہو جائے تو اسی کو حق الیقین کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے نیز یہاں ایمان کے لئے اطمینان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ اطمینان بھی ایمان کا ایک درجہ ہے۔ لیکن چونکہ اطمینان کا لفظ ہے جس کا منجملۂ مراتب ایمان ہونا ابھی ثابت نہیں ہے اس لئے امام بخاری رحمۃ اللہ نے اس آیت کو دوسری آیات قرآن کے ساتھ ذکر نہیں فرمایا بلکہ الگ کر دیا

حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ یہ آیت ہمارے مقصد کے لئے زیادہ ممد ہے اور یہ اس لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایمان کے کمال میں کوئی شبہ نہیں اور جب یہ تسلیم ہے تو ایمان میں زیادتی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ——— معلوم ہوا کسی خارجی چیز میں زیادتی کے بارے میں عرض کر رہے ہیں

وقال معاذ اجلس بنا نومن ساعة ——— حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے شاگردوں سے فرمایا ہمارے پاس بیٹھ جاؤ، ایمان تازہ کر لیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مذاکرہ ایمانی کو ایمان قرار دے رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جو حضرات اعمال کو ایمان سے بالکل بے تعلق بتاتے ہیں درست نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صالحین کا ذکر بھی ایمان ہے، اور ہر وہ چیز جس کا ایمان سے تعلق ہو ایمان کو تازہ کرتی ہے

وقال بن مسعود الیقین الایمان کله۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یقین کل کا کل ایمان ہی تو ہے، یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ کا استدلال لفظ کل سے متعلق ہے اور کل اسی کو کہیں گے جو ذی اجزاء ہو اور کم از کم اس کے دو جزء ہوں۔ اور اگر ترقی کر کے کہیں تو طبرانی کی روایت میں ہے

الصبر نصف الایمان ——— صبر نصف ایمان ہے

معلوم ہوا کہ ایمان میں تنصیف ہے۔ دوسرا استدلال اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ یقین کے مراتب مختلف ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ایمان کے مراتب بھی مختلف ہوں گے کیونکہ ایمان یقین ہی کا نام ہے معلوم ہوا کہ اعمال سے یقین میں اضافہ ہوتا ہے اس لئے اعمال کو ایمان سے بے تعلق کہنا درست نہیں

حالت میں اٹھالے کہ ہم خیر کا کام کر رہے ہوں زندگی میں کوئی ایسا فتنہ نہ ہو جس سے جو گمراہ کن ہو، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سید الاولین والآخرین ہیں لیکن آپ اپنے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں

لا یدخل احد الجنۃ عملہ قالوا ولا	کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں
انت یارسول اللہ قال ولا انا الا	کرسکتا، صحابہ نے عرض کیا اور نہ آپ یارسول
ان یتغمدنی اللہ برحمۃ	اللہ، آپ نے فرمایا اور نہ میں الا یہ کہ اللہ تعالیٰ
(بخاری جلد ۲ ص۹۵)	اپنے دامن رحمت میں چھپالیں

خوف آخرت ہی کے سلسلہ میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال ہیں، کاش ہم درخت ہوتے کاش ہم پتھر ہوتے، قانون ہے کہ جسقدر علم بڑھتا ہے اسی قدر خوف بڑھتا ہے جب صحابۂ کرام اور خود خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال ہے تو حضرت عمر بن عبدالعزیز کی گفتگو وجہ اشکال نہیں ہوسکتی

دوسری بات یہ ہے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کے لئے ترقی کا انحصار ان لوگوں کے لئے ہے جنھوں نے اپنی روح کو مترشح نہیں کیا لیکن وہ حضرات جنہوں نے اپنی روح کو عبادت و ریاضت کے ذریعہ لطیف بنالیا ہے ان کی ترقیات جاری رہتی ہیں بلکہ قبر میں ان کی رفتار تیز تر ہوجاتی ہے کیونکہ اس عالم کی کثافت بھی رفتار میں سستی آجاتی ہے

اہل اللہ قبر میں رہتے ہوئے بھی اپنے عبادت وریاضت کے تمام مشاغل جاری رکھتے ہیں ان معاملات کو کشف قبور والے بخوبی جانتے ہیں، علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی ایک تصنیف میں اس قسم کے بہت سے واقعات نقل فرمائے ہیں،

پھر حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی شان تو بہت بلند ہے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی اور فرمایا کہ اس جوان کی نماز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے بہت قریب ہے۔ اس بنا پر وفات کے بعد بھی ان کی ترقیات کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے، اہل اللہ کو نماز پڑھتے اور قبر میں تلاوت قرآن کرتے دیکھا گیا ہے

قال ابراھیم رب ارنی کیف تحی الموتیٰ ـ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے احیاء موتیٰ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی اور چونکہ کیف میں کبھی سوال ذات سے ہوتا ہے اور کبھی صفات سے اسلئے ناواقف حضرات کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معاذاللہ احیاء موتیٰ کے بارے میں تردد ہے۔ خداوند قدوس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی جواب دلاکر اس تردد کو رفع فرمادیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا —— بلیٰ —— یعنی ایسا نہیں ہے بلکہ مجھے پورا

دین کو ایک ٹھہرایا ہے یہیں اسی طرح ایمان اختلاف اجزاء کے باوجود ایک ہی حقیقت ہے

وقال ابن عباس شرعة ومنهاجا سبيلا وسنة ۔ ہر ایک پیغمبر کے لئے ایک شرعہ اور ایک منہاج مقرر کیا ہے، منہاج بڑے راستہ کو کہتے ہیں اور شرعۃ اس سے نکلنے والے چھوٹے چھوٹے راستوں کو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول سبیلا وسنۃ میں جو شرعۃ ومنہاجا کی تفسیر میں واقع ہے لف ونشر غیر مرتب ہے

پہلی آیت میں اصول کے متعلق فرمایا گیا تھا اور اس آیت میں فروع کے متعلق فرمایا جارہا ہے اور فروع میں ہر زمانہ کے تقاضوں کے مطابق تغیر ہوتا رہتا ہے، اس اختلاف کے باوجود بھی دین ایک ہے اسی طرح مختلف اجزاء پر مشتمل ہونے کے باوجود دین ایک ہے

اس شرعۃ ومنہاجا کے ایک یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ امت کے اندر مختلف حیثیت کے افراد ہیں اور ہر حیثیت کے لئے راہ الگ الگ ہے مرد، عورت کے احکام الگ الگ ہیں، بیمار و تندرست کے احکام میں فرق ہے، حالانکہ مقصد ایک ہے یعنی قرب خداوندی

دعاءکم ایمانکم ——— اس سے بھی جبریہ کی تردید ہو رہی ہے کہ دعا جس کے معنی طلب اور پکار کے ہیں قول وفعل دونوں پر مشتمل ہے۔ کیونکہ دعا زبان اور ہاتھ دونوں کا کام ہے اور اس قول میں دعا و ایمان میں اتحاد بتلایا گیا ہے

لیکن یہاں امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال بے محل سا معلوم ہو رہا ہے، کیونکہ قرآن میں یہ آیت کفار کے متعلق ہے، ارشاد ہے

قل ما يعبؤا بكم ربي لولا دعاءكم ۔ ۱۹ ار ۲ — میرا رب تمہاری ذرا بھی پروا نہ کرے گا اگر تم عبادت نہ کروگے

یعنی ہونا تو یہ چاہیئے کہ تمہیں تکذیب کی سزا دی جائے لیکن اتنی بات ہے کہ جب تم پر مصیبت آتی ہے تو تم پکارتے ہو اور خداوند قدوس تمہاری طلب کی لاج رکھ لیتا ہے یا مطلب یہ ہے کہ تمہاری جماعت میں مسلمان ہیں جو پکارتے ہیں اس لئے تمہاری پرواہ کرلی جاتی ہے یعنی جب تک یہ مسلمان ہیں اس وقت تک تم بھی محفوظ ہو اور اگر یہ مسلمان یہاں سے نکال دیئے گئے تو عذاب کا سلسلہ شروع ہو جائے گا، اسی لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے دعاءکم کی تفسیر ایمانکم سے کی ہے

نیز یہ کہ جب ظاہری پکار کا یہ اثر ہے کہ لاج رکھ لی جاتی ہے تو اگر حقیقی دعا ہو تو وہ یقیناً ایمان ہوگی، اس طرح تنبیہ کی جارہی ہے کہ اگر غضب سے بچنا چاہتے ہو تو اس کے لئے اخلاص نیت کے ساتھ دعا در کار ہے۔

قال ابن عمر لا یبلغ العبد حقیقۃ التقوٰی حتی یدع ما حاک فی الصدر۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ انسان اس وقت تک حقیقتِ تقویٰ کو نہیں پاسکتا جب تک ان چیزوں کو نہ چھوڑ دے جو دل میں کھٹکتی ہوں اس سے معلوم ہوا کہ تقوے کے درجات ہیں تقوے کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان ان چیزوں سے کنارہ کش ہوجائے جو دل میں کھٹکتی ہوں یعنی جن کے متعلق اسے شرح صدر نہو ———— دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ ما فیہ باس ——— کو ما لا باس بہ ——— کی خاطر چھوڑ دے، اسی طرح شرک سے بچنا بھی تقویٰ ہے لیکن یہ تقوے کا ادنیٰ درجہ ہے۔ بہر کیف درجات میں تفاوت ہے۔

اس سے بھی مرجیہ ہی کی تردید ہو رہی ہے کہ تم اعمال کو ایمان کے سلسلہ میں قطعًا موثر نہیں مانتے۔ حالانکہ یہاں چھوٹے چھوٹے اعمال کو تقوے سے تعبیر کیا جارہا ہے

مرجیہ کی تردید اس طرح بھی ہوسکتی ہے کہ تقویٰ یا عین ایمان ہے یا متعلقاتِ ایمان میں سے ہے اگر تقویٰ عین ایمان ہے تو معلوم ہوا کہ ایمان کے مراتب ہیں کیونکہ تقوی کے مراتب ہیں، اور اگر تقویٰ متعلقات ایمان میں سے ہے تو معلوم ہوا کہ تقویٰ ایمان میں مطلوب ہے جسطرح اور اعمال مطلوب ہیں

وقال مجاہد شرع لکم من الدین الخ اس آیت کی تفسیر میں مجاہد فرماتے ہیں، خدا نے تم کو وہ دین دیا ہے کہ جس کی وصیت حضرت نوح کو کی گئی تھی۔ یعنی اصول ایک ہیں جیسے توحید، پیغمبروں پر ایمان، آخرت کا یقین وغیرہ۔ گو فروع میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ گویا جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کا دین مجموعۂ اصول و فروع ہے جو اعمال پر بھی مشتمل ہے اسی طرح آں حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے دین میں بھی اعمال داخل ہیں اور جب اعمال داخل ہیں تو ایمان میں کمی بیشی بھی ہوجائے گی جس کے نتیجہ میں قوت وضعف بھی آجائے گا، اسلاف کے اس حوالہ سے امام بخاری رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے۔ ابن مسعود کی ایک روایت ہے کہ مرنے والوں کا اتباع کرو

فان الحی لا یومن علیہ   اس لئے کہ زندہ کے مستقبل پر اطمینان نہیں کیا جا سکتا

یعنی زندہ کی آئندہ زندگی کے متعلق کچھ بھروسہ نہیں ہے کہ وہ کیا کرنے والا ہے اسی لئے قرآن کریم میں ہدایت یافتہ لوگوں کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے

اولٰئک الذین ھدی اللہ   یہ حضرات ایسے تھے کہ جنکو اللہ تعالیٰ نے ہدایت

فبھداھم اقتدہ   پ ۷ ع ۱۹   کی تھی سو آپ بھی ان ہی کے طریق پر چلئے

اور امام بخاری کا استدلال بایں طور بھی ہوسکتا ہے کہ جس طرح خداوند قدوس اختلاف جبلت کے باوجود

الا اللہ وان محمدا رسول اللہ الحدیث ———— ان پانچوں دعاموں

میں باہمی فرق بھی ہے، ایک دعامہ تو تمام بنیادوں کی بنیاد ہے۔ اور اسی پر قصر کی بقا وفنا کا دار ومدار ہے اور بقیہ دعائم اس کے معاون ہیں، جس طرح دعاموں کی ضرورت خیمہ قائم کرنے کے لئے پڑتی ہے تو ایک دعامہ وسط میں قائم کیا جاتا ہے اور باقی دعائم کو رسیوں سے باندھ دیا جاتا ہے، اگر ادھر ادھر کی رسیاں ڈھیلی پڑجائیں تو وہ خیمہ گرنہیں جائے گا بلکہ سمٹ جائیگا اور وسعت باقی نہ رہے گی، نیز یہ کہ اگر دعائم چاروں طرف سے گرجائیں تو گو خیمہ کی وسعت بالکل باقی نہ رہے گی لیکن خیمہ ابھرا ہوا ضرور نظر آتا رہے گا لیکن اگر بیچ کا دعامہ گر جائے تو خیمہ زمین پر آرہیگا۔ بالکل یہی حیثیت ان امور خمسہ کی ہے ان میں شہادت کی حیثیت قطب کی ہے جس پر خیمۂ اسلام قائم ہے، باقی، نماز، زکوۃ، روزہ، حج بمنزلۂ اوتاد ہیں جن سے رسیاں باندھ دی جاتی ہیں،

شہادت توحید ورسالت باقی ہے تو خواہ اوتاد باقی نہ رہیں اسلام باقی رہے گا اور اگر معاذ اللہ اس شہادت توحید ورسالت میں تزلزل آگیا تو خواہ اوتاد باقی رہیں خیمہ باقی نہ رہیگا

یہاں شبہ کیا جاتا ہے کہ اس طرح مبنی اور مبنی علیہ ایک ہوگئے۔ کیونکہ اسلام ان امور خمسہ پر موقوف ہے اور یہ امور اسلام پر اور اسلام اور ان امور خمسہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حالانکہ قاعدہ کی رو سے مبنی اور مبنی علیہ میں تفاوت اور تغایر ہونا چاہیئے

اس کا جواب شارحین نے بالاتفاق یہی دیا ہے کہ چیز گو ایک ہی ہے لیکن حیثیت مختلف ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ حیثیت کے بدل جانے سے حکم بدل جاتا ہے مجموعی حیثیت سے یہ امور مبنی ہیں اور انفرادی طور پر مبنی علیہ۔ جسطرح کہ خیمہ مجموعہ کا نام ہے، اسمیں قطب، اوتاد اور چھت سب ہی شامل ہیں اور جب یہ پوچھا جائیگا کہ خیمہ کس چیز پر قائم ہے تو کہا جائیگا کہ قطب اور اوتاد پر — اسی طرح یہاں بھی مجموعہ کا نام مبنی ہے اور انفرادی حیثیت سے یہی چیزیں مبنی علیہ ہیں

تشبیہ کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح انسان مکان اور محل میں بیٹھکر پوری طرح محفوظ ہوجاتا ہے، نہ اسے باہر سے حملہ کرنے والے دشمنوں کا خوف رہتا ہے نہ سردی گرمی کا خطرہ رہتا ہے اور نہ یہی خدشہ رہتا ہے کہ اندرونی طور پر کوئی حملہ آور ہوسکتا ہے، بالکل اسی طرح قصر اسلام ہے کہ اس میں داخل ہونے کے بعد انسان کو نہ اندرونی دشمن کا خوف رہتا ہے اور نہ بیرونی دشمن ہی سے خطرہ رہتا ہے انسان کا اندرونی دشمن نفس ہے ارشاد فرمایا گیا

ان النفس لامارة بالسوء ۱۳/۱ — نفس تو بری ہی بات بتلاتا ہے

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دعاء کا ترجمہ ایمان سے فرمایا ہے کیونکہ

الدعاء مخ العبادة　　　　دعا عبادت کی اصل ہے

فرمایا گیا ہے۔ گویا ایمانیات میں دعا کا بہت اونچا مقام ہے، اسی لئے اسے ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے، بہرحال ان تمام آیات، احادیث اور آثار سے یہ ثابت ہوگیا کہ ایمان ترقی بھی کرتا ہے، اور گھٹتا بھی ہے اور اس کمی، زیادتی کا مدار اعمال پر ہے، اس لئے جہمیہ و کرامیہ کا اعمال کو ایمان کے سلسلہ میں بے تعلق اور غیر موثر کہنا درست نہیں ہے

حدثنا عُبَيْدُ اللهِ بنُ مُوسىٰ قَالَ اَنَا حَنْظَلَةُ بْنُ اَبِي سُفْيَانَ عَنْ عِكْرِمَةَ بْنَ خَالِدٍ عَنِ ابنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللهِ وَاِقَامُ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمُ رَمَضَانَ

ترجمہ، عبید اللہ بن موسیٰ نے حدیث بیان کی، فرمایا کہ انہیں حنظلہ بن ابی سفیان نے حضرت ابن عمر بہ واسطۂ عکرمہ بن خالد یہ بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، اور نماز کو قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا ـ

تشریح حدیث | ترجمہ کا مقصد اصلی تھا بنی الاسلام علی خمس، اس کے لئے امام بخاری رحمہ اللہ پہلے آیات و احادیث و آثار کے جملوں سے استدلال کر چکے ہیں، لیکن ابھی تک مرفوع حدیث بیان نہیں فرمائی تھی اب حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت لا رہے ہیں کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ گویا اسلام کو ایسے مکان اور ایسی عمارت سے تشبیہ دی جارہی ہے جس کے قیام کے لئے ستونوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ ستون جب تک قائم رہتے ہیں مکان و عمارت بھی قائم رہتے ہیں ورنہ انہدام کی صورت پیش آجاتی ہے اور اگر کسی ایک ستون کو نقصان پہونچتا ہے تو گو عمارت باقی رہتی ہے لیکن اسمیں کمزوری آجاتی ہے اور آئندہ کے لئے یہ خطرہ لاحق ہوجاتا ہے کہ اگر اصلاح نہ کیگئی تو کسی وقت اور بھی نقصان پیدا ہوسکتا ہے

اسلام کو ایسی ہی عمارت سے تشبیہ دی جارہی ہے جس میں یہ پانچ دعائم ہیں شہادة ان لا الٰہ

اسی طرح زکوۃ کے سلسلہ میں ۔زکوا۔ نہیں فرمایا بلکہ ۔ اٰتوا الزکوٰۃ ۔ فرمایا ہے اس لفظ ایتار سے معلوم ہو رہا ہے کہ شریعت میں اس کے لئے مستقل قانون ہے جس کے بغیر اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں ۔ مثلاً یہ کہ شریعت نے چالیسواں حصہ مقرر کیا ہے اور اس کے لئے مصارف بھی مقرر کردئے ہیں ۔ اور ہر ہر چیز کی زکوٰۃ کا قانون بھی الگ رکھا ہے ۔اب اگر کوئی شخص ان قوانین کی رعایت کئے بغیر زکوٰۃ دیتا ہے تو۔ ایتاء زکوٰۃ ۔ پر اس کا عمل نہیں ہے ،کیونکہ ۔ ایتاء زکوٰۃ ۔ کے معنی ہی یہ ہیں کہ شریعت کے قائم کردہ اصول کے تحت ادائیگی ہو ، اسی لفظ ایتار سے معلوم ہو رہا ہے کہ زکوٰۃ کیلئے تملیک ضروری ہے محض زکوٰۃ نکالکر مال سے الگ رکھدینا یا نکالنے کی نیت کرلینا کافی نہیں ہے

ـ والحج وصوم رمضان ـ حج زمان مخصوص میں مکان مخصوص کی زیارت کا نام ہے اور صوم لغۃً رکنے کو کہتے ہیں ،اصطلاح شرع میں مخصوص چیزوں سے رکنے کا نام صوم ہے

الفاظ حدیث میں تقدیم وتاخیر اور اسکی وجہ بخاری شریف کی اس حدیث میں جو حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہ طریق حنظلہ ذکر کی گئی ہے ،حج کو صوم رمضان پر مقدم ذکر کیا گیا ہے دوسرا طریق مسلم شریف میں ذکر کیا گیا ہے جہاں صوم رمضان حج پر مقدم ہے ،یہاں روایت حضرت سعد بن عبیدہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ذکر کی ہے اور اس میں صوم رمضان کو حج پر مقدم ذکر کیا ، اور انہیں حنظلہ سے مسلم نے بھی صوم کو حج پر مقدم ذکر کیا ہے ،اب گویا حنظلہ سے دونوں طریقے منقول ہیں اور سعد بن عبادہ کی روایت سے دوسرے بیان کی تائید ہو رہی ہے

مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ جب حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ـــ صوم رمضان والحج ـــ فرمایا تو راوی نے حضرت ابن عمرؓ سے عرض کیا ـــ الحج وصوم رمضان ـــ یعنی اس سے پہلے آپ نے حج کو صوم رمضان پر مقدم ذکر فرمایا تھا ۔ اس پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ـــــ ھکذا سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ

اب اشکال یہ ہے کہ جب دونوں طریقے اصول محدثین کے اعتبار سے صحیح ہیں تو حضرت ابن عمرؓ نے اس کی تردید کیوں فرمائی اور اگر تردید صحیح ہے تو حنظلہ کی روایت میں دونوں طریقے کیوں منقول ہیں ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طرح سنا ہے ۔ کسی موقعہ پر آپ نے حج کو مقدم ذکر فرمایا اور کسی موقعہ پر صوم رمضان کو ، ورنہ ایک روایت کو نقل بالمعنی کہنا ہوگا ،چنانچہ حافظ ابن حجر نے بخاری شریف کی اس روایت کو نقل بالمعنی کہا ہے اور مسلم شریف کی روایت کو اصل قرار دیا ہے کیونکہ اس میں سماع کی تصریح ہے اور بخاری کی روایت میں یہ نہیں ہے گویا

لیکن اسلام کے احکام پر پوری طرح کاربند ہے تو ان شاء اللہ نفس کچھ نہیں کرسکتا۔ الامن ربی کا استثنار ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے۔ اور انسان کا بیرونی دشمن شیطان ہے لیکن سچے اور مخلص مسلمان کا وہ بھی کچھ نہیں کرسکتا۔ الا عبادك منهم المخلصين ۔ کا استثنار اسی لئے کیا گیا ہے۔
اسی طرح سردی اور گرمی کے خوف کا مفہوم یہ ہے کہ جہنم کے دو طبقہ ہیں طبقۂ نار اور طبقۂ زمہریر۔ مگر قصر اسلام میں پوری طرح آجانے کے بعد اس کا بھی خطرہ نہیں رہتا

امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد امام بخاری علیہ الرحمہ نے اس باب میں یہ ثابت فرمایا ہے کہ ایمان کمی و بیشی کو قبول کرتا ہے، اس حدیث سے یہ عملا اس طرح ثابت ہے کہ یہاں اسلام میں پانچ چیزوں کو بنیاد بتایا گیا ہے اور یہ پانچوں چیزیں ہر شخص میں نہیں پائی جاتیں۔ کوئی نماز نہیں پڑھتا کوئی زکوٰۃ نہیں دیتا، کوئی حج کے معاملہ میں کوتاہی کرتا ہے، کسی سے روزے کے معاملہ میں تساہل ہوجاتا ہے بس اسی اعتبار سے مراتب ایمان میں تفاوت آجاتا ہے۔ کسی کا اسلام ناقص ہے اور کسی کا تام۔ تام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی یہ علامتیں اس میں پورے طور پر موجود ہوں۔ یا مثلاً اسی نماز کے نہ ہوسکنے کے باعث عورت کا دین ناقص ہے، عورتوں کو ۔ ناقصات العقل والدين ۔ فرمایا گیا ہے کیونکہ عورت ایک ماہ میں چند ایام بغیر نماز کے گذارتی ہے۔ اسی طرح عورت رمضان میں چند روزے وقت پر نہیں رکھ پاتی۔ اور اسی پابندیٔ اعمال سے دین میں تمامیت و نقصان کا پتہ چلتا ہے۔ پابندیٔ اعمال سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے دل میں لگن ہے اور اذعان و تصدیق حاصل ہے اور اگر پابندیٔ اعمال نہیں ہے تو یہ نقصان دین کی علامت ہے۔ قرآن کریم میں نماز میں سستی کرنے والوں کے بارے میں کہا گیا ہے

واذا قاموا الى الصلوة قاموا	اور جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی
كسالى يراءون الناس ولا	کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں صرف آدمیوں
يذكرون الله الا قليلا ۔	کو دکھلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی نہیں کرتے
پ ۵ ر ۱۸	مگر بہت ہی مختصر ۔

غرض اسی اعمال کی کمی و بیشی سے امام بخاری رحمہ اللہ نے ایمان کی کمی بیشی پر استدلال کیا ہے،

حل لغات نماز کے لئے ۔ اقام الصلوٰۃ ۔ فرمایا ہے، اقامت ۔ کھڑا کرنا، اور سیدھا کرنا، مراد یہ ہے کہ نماز کے لئے جو قانون بتایا گیا ہے اور وقت و شرائط کے بارے میں جو کچھ تعلیم کیا گیا ہے ان سب چیزوں کی رعایت کے ساتھ نماز کا ادا کرنا اقامت ہے۔ اور لفظ اقامت استعمال کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا مفہوم بہت وسیع ہے ورنہ ۔۔۔ صلوا ۔۔۔ بھی فرمایا جاسکتا تھا،

اسی طرح حدیث میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا یہ مطلب ہے کہ میں نے اس طرح بھی سنا ہے فرق یہ ہے کہ ایک جگہ شاگرد کو تنبیہ کی غرض سے ـــ ھٰکذا سمعت ـــ کی تصریح آگئی ہے اور دوسری ترتیب کے سلسلہ میں اسکی نوبت نہ آسکی ۔ اب ان دونوں طریقوں کے لئے معقول وجہ ہونی چاہئے ۔ جو عنقریب ذکر ہوں گی ۔

عبادات کی دو قسمیں ہیں وجودی اور ترکی ، پھر وجودی کی دو قسمیں ہیں فعلی اور قولی ، اور پھر فعلی کی دو قسمیں ہیں بدنی اور مالی ۔ حدیث شریف میں ذکر کی گئی تمام عبادتیں صوم کے علاوہ وجودی ہیں ۔ اس لئے پہلے تمام وجودی عبادتوں کو ایک جگہ ذکر فرمایا اور ان میں بھی حج کو سب سے موخر ذکر کیا کیونکہ باقی تمام عبادتوں کا خود ہی ادا کرنا ضروری ہے اور حج میں نیابت بھی چل جاتی ہے اور صوم کو سب سے آخر میں اس لئے ذکر کیا کہ وہ ترکی عبادت ہے

اور اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے کہ بلحاظ زمانہ صوم رمضان کی فرضیت مقدم ہے صوم رمضان، کی فرضیت ۲ھ کی ہے اور حج کی فرضیت ۹ھ کی ہے تو اس اعتبار سے صوم کی تقدیم انسب معلوم ہوتی ہے ۔ نیز صوم کی تقدیم اس لئے بھی مناسب ہے کہ صوم کا مکلف ہر بالغ ہے اور حج ہر شخص سے مطلوب نہیں ہے ۔ نیز یہ کہ حج عمر میں صرف ایک بار واجب ہوتا ہے ۔ اور روزہ برابر ساتھ لگا ہوا ہے ۔ غرض ہر ہر چیز کے لئے مناسب وجہ موجود ہے ۔

اور اگر ہم عبادت کے مقصد پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ عبادت کا مقصد خداوند قدوس کا قرب ہے ۔ اور اس کے لئے بدنی و مالی دونوں قسم کی عبادتیں درکار ہیں ۔ کیونکہ بدنی عبادت ، تواضع سکھلاتی ہے اور مالی عبادت جذبہ بخل سے مال کی محبت کو دور کرتی ہے ۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان عبادت کے ذریعہ غرور و تکبر نکال دے اور حاکم حقیقی کو ہر طرح تسلیم کرلے ۔ اس کے بعد دوسرا درجہ یہ ہے کہ اسے اس کا بھی یقین ہو جائے کہ مال میرا نہیں ہے بلکہ اس کا مالک خدا ہے ۔ جب صلوٰۃ و زکوٰۃ کے ذریعہ یہ منزلیں طے ہوگئیں تو وہ عمل بتلایا گیا جو دونوں سے مرکب ہے یعنی حج ۔ اس سلسلہ میں بدن اور مال دونوں کی قربانی دینی پڑتی ہے ، بدن کے تمام آرام ترک کرنے پڑتے ہیں اور ایک مکان مخصوص سے تعلق ہونے کی بنا پر مصارف بھی آجاتے ہیں

جب یہ منزل بھی طے ہوگئی تو اس عبادت کی تعلیم دی گئی جس سے بندہ خداوند قدوس سے قریب ہوسکے یعنی روزہ ۔ حج میں کم از کم کھانے ، پینے کی ممانعت نہ تھی لیکن روزے میں اسکی بھی اجازت نہیں دی گئی ، اور دوسری عبادات میں یہ شان نہیں ہے ، نماز میں بھی گو کھانے کو موقوف کردیا جاتا ہے لیکن اس کا وقت اتنا کم ہے کہ مشقت نہیں ہوتی ، روزے میں وقت زیادہ لگتا ہے ۔ اس لئے یہ درجہ

جب اُس روایت میں تصریح ہے اور حنظلہ کی ایک روایت بھی اس کی موافقت میں ہے تو نقل بالمعنی کہنے میں کوئی حرج نہیں ۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ جواب قاعدہ کے مطابق صحیح ہے اور اس کے تسلیم کرنے میں وہی شخص پس و پیش کرے گا جو محدثین کے طریقہ سے ناواقف ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ حافظ کا یہ جواب امام بخاری رحمہ اللہ کی شان کے خلاف ہے ۔ کیونکہ اگر امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک یہ محقق ہوتا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت اصل نہیں ہے تو امام اس کو بنیاد نہ قرار دیتے

بنیاد قرار دینے کا یہ مطلب ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے جامع صحیح میں ابواب حج کو ابواب صیام سے پہلے ذکر فرمایا ہے ۔ اس ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک یہی روایت اصل ہے اس لئے کسی اور اچھی توجیہ کی ضرورت ہے

درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی معتمد استاد کسی چیز کو نقل کر رہا ہو تو شاگرد کو اعتراض کا حق نہیں ہوتا اور نہ استاد پر گرفت ہی درست ہوتی ہے ۔ چنانچہ جب شاگرد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ پہلے ـــــ صوم رمضان والحج ـــــ فرما چکے ہیں اور اب ـــــ الحج وصوم رمضان ـــــ فرما رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھول رہے ہیں ۔

اس پر حضرت ابن عمرؓ نے تنبیہ فرمادی کہ تمہیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے ـــــ ھکذا سمعت ـــــ یعنی میں نے ایسے بھی سنا ہے ، گویا تنبیہ کے ساتھ ساتھ وجہ تنبیہ بھی بیان فرمادی

ـــــ ھکذا سمعت ـــــ کا یہ مطلب لینا کہ میں نے ایسا ہی سنا ہے درست نہیں ہے بلکہ یہ ایسا ہی ہے جیسے حضرت حزام بن حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سورۂ فرقان کی تلاوت اس طریقہ کے خلاف کر رہے تھے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علم میں تھا

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنا تو غضبناک ہوئے اور چاہا کہ اسی حالت میں چادر گھسیٹتے ہوئے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لیجائیں ، لیکن نماز سے فارغ ہونے کا انتظار فرمایا ، فراغت کے بعد چادر سے گردن اینٹھتے ہوئے خدمت اقدس میں لے گئے اور عرض کیا کہ یہ قرآن کریم غلط پڑھتے ہیں ۔ آپ نے فرمایا انہیں چھوڑ دو اور پھر حضرت حزام سے قرآن کریم سنا ، حضرت حزام نے اسی طریقہ پر تلاوت فرمائی ۔ آپ نے فرمایا ـــــ ھکذا انزلت ـــــ پھر حضرت عمرؓ سے فرمایا تم پڑھو ، حضرت عمرؓ نے اسی طرح تلاوت کی جو ان کے علم میں تھی ، آپ نے سنکر فرمایا ـــــ ھکذا انزلت ـــــ اس کے یہ معنی نہیں کہ اسی طرح نازل ہوئی ہے کسی دوسرے طریق پر پڑھنا درست نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس طرح بھی نازل ہوئی ہے اور اس طرح بھی ۔

یہ مفہوم ہوسکتا ہے کہ خداوند قدوس ان کو اپنے ذمہ لے لے
اس اعتبار سے حج کو تمام چیزوں سے موخر ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ غرض ہر ترتیب کے لئے ایک مناسب وجہ موجود ہے۔

بَابُ اُمُوْرِ الْاِیْمَانِ وَقَوْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ اِلٰى قَوْلِهٖ اَلْمُتَّقُوْنَ ۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الآيَة ـــ

ترجمہ ـــ باب۔ امور ایمان کے بیان میں اور خداوند قدوس کا یہ ارشاد کہ کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آ گیا) کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو یا مغرب کو لیکن (اصلی) کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ (کی ذات و صفات) پر یقین رکھے۔ اور اسی طرح قیامت کے دن (آنے پر بھی) اور فرشتوں کے وجود پر بھی، اور سب کتب سماویہ پر اور پیغمبروں پر اور (وہ شخص) مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں۔ (اپنے حاجت مند) رشتہ داروں کو اور (نادار) یتیموں کو اور دوسرے محتاج لوگوں کو اور (بے خرچ) مسافروں کو اور (لاچاری میں) سوال کرنے والوں کو (اور قیدی اور غلاموں کی) گردن چھڑانے میں اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص (ان عقائد و اعمال کے ساتھ یہ اخلاق بھی رکھتے ہوں کہ) اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب (کسی جائز امر کا) عہد کر لیں، اور وہ لوگ مستقل (مزاج) رہنے والے ہوں تنگدستی میں اور بیماری میں اور (معرکہ) قتال میں (بس یہی) لوگ ہیں جو سچے (کمال کے ساتھ موصوف) ہیں اور یہی لوگ ہیں جو سچے (متقی کہے جا سکتے) ہیں ـــ بالتحقیق ان مسلمانوں نے فلاح پائی جو اپنی نمازیں خشوع کرنے والے ہیں ـ الآیۃ ـــ

مقصد ترجمہ | امام بخاری رحمہ اللہ باب سابق میں بنیادی چیزیں بیان فرما چکے ہیں اب فروع بیان کرنا چاہتے ہیں، گویا اسلام میں کچھ چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، اور کچھ کو فروع کی حیثیت دی گئی ہے اس باب میں فروع کا بیان مقصود ہے اسی لئے امور کا لفظ استعمال کیا گیا ہے
دوسرے یہ کہ اس ترجمہ میں ایک شبہ کا رفع بھی ہو سکتا ہے، سابق ترجمہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اسلام صرف ان پانچ بنیادی چیزوں کا نام ہے، باقی چیزیں داخل اسلام نہیں اور جب اسلام ہی سے خارج ہیں تو ایمان سے بدرجۂ اولیٰ خارج ہوں گی، حالانکہ تمام اوامر و نواہی اسلام کا جز ہیں اور ان ہی پر عمل کرنے سے ایمان میں نور آتا ہے ـــ اس شبہ کے رفع کے لئے امام بخاری

آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ نفس کو اس درجہ مرتاض کر لیا جائے کہ وہ مال اور جان کو کوئی حیثیت نہ دے اس اعتبار سے بھی صوم کو حج سے موخر ہی ہونا چاہیئے کیونکہ بندہ اس میں ــ تخلقوا باخلاق الله ــــ کی صفت سے متصف ہو جاتا ہے

اور اس اعتبار سے صوم رمضان کو حج سے مقدم ، یا حج کو صوم رمضان سے موخر کرنا انسب ہے کہ حج خاص وہ چیز ہے جس میں بندہ اپنی محبت کا پورا ثبوت دیتا ہے ، دیوانگی ، وارفتگی جو عاشق کے احوال میں سے ہے حاجی کے افعال سے پوری طرح نمایاں ہوتی ہے ۔

ان افعال کی ابتدا وہاں سے ہوئی تھی جہاں پہلے بدن کو مرتاض کیا تھا ، دن میں پانچ بار ریاضت کی جس میں کھانا ، پینا ممنوع تھا اور دنیا کی تمام چیزوں سے کامل انقطاع بھی

یہی انقطاع تمام روحانی ترقیات کی اصل ہے کیونکہ روحانی ارتقاء کے لئے ضروری ہے کہ انسان ان تمام چیزوں سے کنارہ کش ہو جائے جو قرب خداوندی اور اخلاق خداوندی کے اختیار سے مانع ہیں ، اور یہ دو طرح کی شہوتیں ہیں شہوت بطن اور شہوت فرج ، دنیا کے تمام کاروبار انہی کے گرد گھومتے ہیں ۔ اسی ترک اکل وشرب اور ترک جماع سے روزہ عبارت ہے جس کے صلہ میں

الصیام لی وانا اجزی به وفی روایۃ — روزہ میرے لئے ہے اور میں خود اس کا بدلہ دونگا اور

انا اجزی به (بخاری کتاب الصوم ص۲۵۴) — دوسری روایت میں ہے کہ میں خود اس کی جزا ہوں

فرمایا گیا ہے ۔ جب یہ مرتبہ بھی حاصل ہو گیا تو اب تخلیہ کا حکم دیا گیا تاکہ تخلیہ میں جمال کا پر تو ڈالا جائے اور جب خیالات ہمہ تن محبوب کی طرف ہو گئے تو دیار محبوب کی حاضری کا حکم ملا اور اس کے لئے درمیان میں کچھ وقفہ بھی دیا گیا ، روزہ میں تو کھانا ، پینا ترک کرا دیا تھا جب اس کی عادت ہو گئی تو احرام کے بعد اور بھی دوسری حلال چیزیں حرام کردی گئیں ۔ روزہ میں تو رات کے وقت ان چیزوں کو حلال کر دیا جاتا تھا لیکن اس میں مسلسل طور پر اور بھی دوسری مباح وجائز چیزوں کو یکسر حرام قرار دیدیا گیا

یہاں اگر سہواً بھی لغزش ہو جائے تو فدیہ آجاتا ہے اور شان بالکل دیوانوں کی ہے ، اور گرد گھومتا ہے ، دیواروں کو چومتا ہے ، پردے پکڑ کر روتا ہے ، ان تمام چیزوں کے بعد پھر قربانی کا حکم دیا جاتا ہے ، اور اسکی جزا ہے

خرج کیوم ولدته امه — اس طرح پاک ہو کر نکلتا ہے جیسے آج ہی پیدا ہوا ہے

حقوق اللہ سے متعلق تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور ابو داؤد کی ایک روایت کے مطابق حقوق العباد بھی لیکن یہ روایت متمسک نہیں ہے ، اگرچہ یہ خدا کی رحمت سے بعید نہیں ، حقوق العباد کی معافی اور ادائیگی کا

کرتے کبھی یہ اعتراض کرتے کہ انہیں پیغمبری کا دعویٰ ہے، اگر یہ سچ ہے تو پیغمبروں نے تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی ہے، آپ نے کعبہ کو اختیار کرلیا، کبھی کہتے کہ ملت ابراہیمی کے دعویدار ہیں اور عمل اسکی مخالفت میں ہے بہر کیف یہ مختلف قسم کی آوازیں اٹھ رہی تھیں، خداوند قدوس نے آیت نازل فرمادی۔ لیس البر ان تولوا وجوھکم الآیۃ ــــ یعنی کیا تم نے یہ سمجھا ہے کہ ادھر ادھر رخ کرلینا بر کا کام ہے، بر تو اطاعت کا نام ہے جس طرف حاکم نے حکم دیا اسی طرف بے تردد رخ کرلیا، کیا تم نے خدا کو مشرق و مغرب کی حدود میں پابند سمجھا ہے، پھر آیت میں ان تمام باتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جو انسانی کمالات کا خلاصہ ہیں

مجموعی اعتبار سے انسانی کمالات کے تین شعبے ہیں۔ پہلا کمال یہ ہے کہ انسان کے عقائد بالکل صحیح ہوں، دوسرا کمال یہ ہے کہ انسان کی معاشرتی زندگی بے داغ ہو، تیسرا کمال یہ ہے کہ وہ ہمیشہ تہذیب نفس کی کوشش میں لگا رہے، آیتِ کریمہ میں تینوں چیزیں موجود ہیں، پہلی چیز یعنی اعتقادیات کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا گیا۔

من آمن باللہ والیوم الآخر و الملائکۃ والکتاب والنبیین	جو شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتب پر اور پیغمبروں پر یقین رکھے

سـ ۲ پ ۶

آگے حسن معاشرت کے سلسلہ میں ارشاد ہے

آتی المال علی حبہ ذوی القربی و الیتامیٰ والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب سـ ۲ پ ۶	اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں۔

یعنی خدا کی محبت میں مال کو ان لوگوں پر صرف کرو جن میں اقرباء اور غرباء ہیں جو اپنی ناداری، مسکنت اور یتیمی کے باعث مستحق امداد ہیں۔ ان آیات میں آزاد کرانے کی راہیں نکالنے کی تاکید کی گئی ہے، یعنی غلاموں کو مکاتب بناؤ اگر وہ غلام ہیں تو انہیں خرید کر آزاد کرو

آگے تہذیب نفس کا معاملہ ہے اس کے دو پہلو ہیں ایک فرائض کی ادائیگی سے متعلق ہے جس سے تہذیب نفس ہوتی ہے اور دوسرے حسن اخلاق ہے فرائض کی ادائیگی کے سلسلہ میں ارشاد ہے

اقام الصلوۃ واتی الزکوۃ سـ ۲ پ ۶	اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوۃ بھی ادا کرتا ہو

اور پھر حسن اخلاق کے سلسلہ میں ارشاد ہے

والموفون بعھدھم اذا عاھدوا	اور جو اشخاص اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں

رحمہ اللہ نے تو حصر کی کہ یہی پانچ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ اور بھی چیزیں اسلام میں داخل ہیں، تیسری بات یہ ہے کہ امام کا مقصد اجمال کے درجہ میں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ایمانیات کے ابواب میں مرجیہ کی تردید کر رہے ہیں، اس لئے اب بالکل واضح طریقہ پر یہ بتلا رہے ہیں کہ ایمان چند امور کے مجموعہ کا نام ہے

امور الایمان ــــ میں اضافت بیانیہ بھی ہو سکتی ہے اس وقت معنی ہوں گے ــــ الامور التی ھی الایمان ــــ یعنی وہ امور جو عین ایمان ہیں اور اضافت لامیہ بھی ہو سکتی ہے اور اس وقت معنی ہوں گے الامور التی ھی للایمان مکملات ــ وہ امور جو ایمان کے لئے مکمل ہیں. ایمان کی روشنی بڑھاتے ہیں اور یہ اضافت بمعنی فی بھی ہو سکتی ہے یعنی الامور الداخلۃ فی الایمان ــــ

ترجمہ کا آیت ذیل سے ربط | امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے مقصد کے اثبات کے لئے دو آیتیں پیش فرمائی ہیں پہلی آیت میں تو امور ایمان گنائے گئے ہیں اور دوسری آیت میں مومن کی چند صفات کا بیان ہے

پہلی آیت کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے عبدالرزاق سے بروایت مجاہد حضرت ابوذر رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے بارے میں سوال فرمایا آپ نے آیت تلاوت فرمادی ــ

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من آمن باللہ والیوم الاخر والملائکۃ والکتاب والنبیین وآتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب واقام الصلوۃ وآتی الزکوۃ والموفون بعھدھم اذا عاھدوا والصابرین فی البأساء والضراء وحین البأس اولئک الذین صدقوا واولئک ھم المتقون

لیکن حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت علی شرط البخاری نہ تھی اس لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کو چھوڑ دیا اور اس سلسلہ کی آیت ذکر فرمادی. آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان میں بہت سی چیزیں داخل ہیں اور سب بدرجۂ خود مکمل ہیں، عام اس سے کہ آپ اسے جزمانیں یا نہ مانیں لیکن جب قرآن کریم نے ان اعمال کی ضرورت کا اثبات کیا ہے تو مرجیہ کی تردید ہو گئی

زمخشری نے اس آیت کے سلسلہ میں تصریح فرمائی ہے کہ اصل میں یہ آیت اہل کتاب کے معاملہ کو رد کرتی ہے، نصاریٰ کا قبلہ مشرق تھا اور یہود کا مغرب. مدینہ طیبہ میں ہجرت کے بعد استقبال بیت المقدس سولہ ماہ رہا. اور پھر جب تحویل کردی گئی تو اعتراضات شروع ہوئے کہ یہ کیا تماشا ہے، کبھی ادھر رخ کرنے لگتے ہیں اور کبھی ادھر، ان کا کوئی مذہب ہی نہیں معلوم ہوتا ورنہ پختگی سے اس پر عمل

۱؎ کشاف جلد اول ص۱۶۳ ۱۲

کیا گیا ہے اور پہلی آیت میں اس توجیہ کی ضرورت بہرحال پڑتی ہے کہ ایمان اور بر ایک ہی چیز ہیں، لیکن امام بخاری رحمہ اللہ کے پاس اس کی معقول وجہ ہے کہ جب حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے پیغمبر علیہ السلام سے سوال کیا تو آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی تھی، بس اسی لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو مقدم کیا

یہاں دونوں آیتوں کے درمیان امام بخاری رحمہ اللہ نے کچھ فاصلہ قائم نہیں فرمایا۔ گو بخاری کے بعض نسخوں میں واو عاطفہ اور بعض میں۔ وقول اللہ۔ کا اضافہ بھی ملتا ہے۔ لیکن اگر ان نسخوں کو نہ لیں، تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس فصل کے نہ رکھنے کی ایک وجہ بیان فرمائی ہے، کہتے ہیں کہ قد افلح المومنون۔ متقون۔ کی تفسیر میں بھی واقع ہو سکتا ہے۔ لیکن بات دل لگتی نہیں ہے اول تو آیتیں الگ الگ ہیں اور جب اصیلی کی روایت میں۔ وقول اللہ۔ موجود ہے تو پھر ان تاویلات کی چنداں ضرورت نہیں اور نہ ان نسخوں سے صرف نظر مناسب ہے

حدثنا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْجُعْفِيُّ قَالَ ثنا اَبُوْ عَامِرٍ الْعَقَدِيُّ قَالَ ثنا سُلَيْمَانُ بْنُ بِلَالٍ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ اَبِيْ صَالِحٍ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْاِيْمَانُ بِضْعٌ وَّسِتُّوْنَ شُعْبَةً وَّالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ

ترجمہ۔ عبد اللہ بن محمد جعفی نے حدیث بیان کی فرمایا کہ ہم سے ابو عامر عقدی نے بواسطہ سلیمان بن بلال عن۔ عبد اللہ بن دینار عن ابی صالح، حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان کے کچھ اوپر ساٹھ شعبے ہیں اور حیا، ایمان کا ایک شعبہ ہے

حدیث شریف کے بیان کرنے کا مقصد مرجیہ کی تردید ہے جو اعمال کو ایمان سے بے تعلق بتلاتے ہیں تردید اس طرح ہے کہ جس قدر اعمال حدیث شریف میں بہ عنوان شعبہ مذکور ہیں، وہ سب ایمان سے متعلق ہیں معنی یہ ہیں کہ جس طرح درخت کی رونق اس کی شاخوں، پتوں اور پھلوں سے ہوتی ہے اسی طرح ایمان کی رونق اس کا ثمر در ہونا ہے اور یہ اعمال کے تعلق پر موقوف ہے اور جب یہ تمام ثمرات اعمال کی وجہ سے ایمان سے متعلق ہوتے ہیں تو نتیجہ واضح ہے کہ بدعمل انسان کے ایمان میں ضرور نقصان آئیگا اور جس طرح درخت کی رونق، پتے گر جانے، شاخیں سوکھ جانے، اور پھول جھڑ جانے سے جاتی رہتی ہے اسی طرح ایمان بھی اعمال سوء کے اختیار کرنے سے خطرہ میں آجاتا ہے، اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ بدعملی ایمان پر اثر انداز نہیں ہوتی، اور یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح اصل سے درخت کی یہ شاخیں نکلی ہیں اسی طرح ایمانیات

لہ فتح الباری ص۳۹ ج۱ ۱۲

والصابرین فی البأساء والضراء	جب عہد کرلیں اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں
وحین البأس پ ۲ ر ۶	تنگدستی میں اور بیماری میں اور قتال میں

کیونکہ خلاف عہد کرنا نفاق کی علامت ہے، ارشاد فرمایا گیا

اذا حدث کذب واذا وعد	جب بات کرے جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے
اخلف (بخاری ص ۱)	وعدہ خلافی کرے

باساء - شدت فقر — ضراء - شدت مرض — حین البأس — جنگ کی تیزی — گویا ان چیزوں میں صبر بھی اخلاق کی بلندی اور کردار کی مضبوطی کی دلیل ہے

دوسری آیت میں مومن کی چند صفات بیان کی گئی ہیں، پوری آیت ملاحظہ ہو

قد افلح المومنون الذین ہم فی	بالتحقیق ان مسلمانوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز
صلاتہم خاشعون والذین ہم	میں خشوع کرنے والے ہیں اور جو لغو باتوں سے
عن اللغو معرضون والذین ہم	برکنار رہنے والے ہیں۔ اور جو اپنا تزکیہ کرنے
للزکوٰۃ فاعلون والذین ہم لفروجہم	والے ہیں اور جو اپنی سترگاہوں کی حفاظت
حافظون الا علی ازواجہم او ما	کرنے والے ہیں لیکن اپنی بی بیوں سے یا اپنی
ملکت ایمانہم فانہم غیر ملومین	لونڈیوں سے، کیونکہ ان پر کوئی الزام نہیں۔
فمن ابتغی وراء ذلک فاولٰئک ہم	ہاں جو اس کے علاوہ طلبگار ہو ایسے لوگ حد سے
العٰدون والذین ہم لامٰنٰتہم و	نکلنے والے ہیں اور جو لوگ اپنی امانتوں اور اپنے
عہدہم راعون والذین ہم	عہد کا خیال رکھنے والے ہیں، اور جو اپنی نمازوں
علیٰ صلوٰتہم یحافظون اولٰئک	کی پابندی رکھتے ہیں، ایسے ہی لوگ وارث
ہم الوارثون الذین یرثون الفردوس	ہونے والے ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے
ہم فیہا خٰلدون پ ۱۸ ر ۱	وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے

مومنین کی یہ صفت کاشفہ ہوں یا مادحہ، لیکن اتنا ضرور معلوم ہوگیا کہ مومن کا مومن ہونا کن باتوں سے ظاہر ہوتا ہے، بہرکیف دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ ایمان میں اور بھی بہت سی چیزیں داخل ہیں اور مرجیہ کا یہ کہنا کہ تصدیق کے بعد کسی عمل خیر کی ضرورت نہیں رہتی غلط ہے

آیتوں کی ترتیب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کو مقدم رکھا ہے جس میں ایمان کو "بر" سے تعبیر کیا گیا ہے، حالانکہ دوسری آیت اس سلسلہ میں زیادہ صاف تھی کیونکہ اس میں مومن کا لفظ استعمال

اکثر میں اقل کی نفی نہیں ہوتی

بعض حضرات کا خیال ہے کہ ناقص کو لیا جائیگا کیونکہ یہ متیقن ہے متیقن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ـ سبعون ـ کی روایت مسلم میں عبداللہ بن دینار کے طریق سے ہے اسی طرح صحیح ابوعوانہ میں بھی یہ روایت موجود ہے لیکن دونوں جگہ بہ طریق شک ہے اور سنن میں جو روایت ہے وہ صرف ـ ستون ـ کی ہے۔ اب اگر ان سنن صحیح کی روایات میں تقابل کیا جائے تو متیقن سنن ہی کی روایت ہے کیونکہ یہ سنن و صحیح دونوں میں بہ صیغۂ یقین ہے اور سبعون ـ کی روایت صرف صحیح میں ہے اور بہ صیغۂ شک ہے

علامہ عینیؒ رحمہ اللہ نے اس موقعہ پر ـ ستون اور سبعون ـ کے لئے ایک نکتہ بیان فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں۔ عدد کی تین قسمیں ہیں، زائد، تام، ناقص، زائد عدد وہ ہے جس کے اجزاء کا مجموعہ اسکے کل سے بڑھ جائے جیسے بارہ۔ اس کے اجزاء ترکیبی نصف، ربع، ثلث، سدس، نصف السدس ہیں۔ ان کا مجموعہ ہوتا ہے سولہ۔ جو بارہ سے زائد ہے۔ ناقص کی مثال ہے چار اس کا اجزاء دو ہیں نصف اور ربع، ان کا مجموعہ تین ہوتا ہے جو چار سے کم ہے۔ اور تام کی مثال ہے چھ۔ اس کے تین جزء ہیں، نصف، سدس ثلث، ان کا مجموعہ بھی چھ ہی ہوتا ہے۔ گویا عدد تام چھ ہو گیا اور جب مبالغہ کیا تو آحاد کو عشرات بنا دیا اب چھ کے ساٹھ ہو گئے، اور پھر ابہام و تکثیر کے لئے ـ بضع ـ کا اضافہ کر دیا گیا،

اسی طرح علامہ عینیؒ رحمہ اللہ نے ـ سبعون ـ کی بھی وجہ تحریر فرمائی ہے اور وہ یہ کہ سات کا عدد ایک ایسا عدد ہے جس میں فرد، زوج، فرد اول، فرد مرکب، زوج اول، زوج مرکب، منطق اور اصم سب ہی طرح کی تقسیمات چل سکتی ہیں، اس لئے سات کے عدد کو اختیار فرمایا اور مبالغہ کے لئے آحاد کو عشرات کر دیا گیا، ستر ہو گئے، اور اب ـ بضع ـ کی زیادتی کا مفہوم چھ کو اصل ماننے کی صورت میں چھ اور سات کو اصل ماننے کی صورت میں سات ہو گا

نیز یہ کہ جن حضرات نے ان اعداد کو حصر کے لئے بتلایا ہے انہوں نے ایمان کے شعبوں کو گنا یا بھی ہے، حدیث شریف میں ہے

افضلها قول لا اله الا الله وادناها	ان شعبوں میں سب سے اعلیٰ لا الٰہ الا اللہ کہنا ہے اور
اماطة الاذیٰ عن الطریق (مسلم ص۴۷ ج۱)	سب سے ادنیٰ راستہ میں سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا

اس سے ادنی اور اعلیٰ کی تعیین تو ہو گئی، لیکن درمیان کے مراتب رہ گئے اس کے لئے علامہ عینیؒ اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ نے ابن حبان بستی کی کتاب وصف الایمان وشعبہ ـ سے نقل کیا ہے کہ ابن حبان نے طاعات کو شمار کرنا شروع کیا تو ان کی تعداد حدیث کی بیان کردہ تعداد سے بہت بڑھ گئی، پھر احادیث پر اس اعتبار سے

لہ عینی ص۱۴۹ ج۱ ۱۲ کہ عینی ایضا ۱۲ سے عینی ص۱۵۰ ج۱

یں اصل تصدیق ہے اور باقی چیزیں اس کی فرع ہیں اور جب تصدیق انسان کے دل میں مضبوط ہوتی ہے تو ایمان اعمال کی شکل میں تمام جوارح پر مسلط ہوجاتا ہے اور جب جوارح سے اعمال سرزد ہونے لگتے ہیں تو دوسرے لوگ اس سے سبق حاصل کرتے ہیں اسی لئے ارشاد فرمایا گیا ہے

الم تر کیف ضرب الله مثلا کلمة	کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ نے کیسی مثال بیان فرمائی
طیبة کشجرة طیبة اصلها ثابت ها	ہے کلمۂ طیبہ کی کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے
فرعها فی السماء ۔ پ ۱۳ ر ۱۶	جس کی جڑ خوب جمی ہو اور شاخیں اونچائی میں جارہی ہوں

اس آیت سے احناف کا مسلک صاف طریقہ پر ثابت ہورہا ہے کہ ایمان کے ساتھ اعمال فرع کی طرح قائم ہیں، کلمہ جسقدر مضبوط ہوگا اسی قدر اس کی شاخیں بلند ہونگی

الیه یصعد الکلم الطیب والعمل	اچھا کلام اسی تک پہونچتا ہے اور اچھا کام اسکو
الصالح یرفعه ۔ پ ۲۲ ر ۱۴	پہنچاتا ہے

کلمہ کو نیچے سے اوپر اٹھانے کی طاقت اعمال صالحہ پیدا کرتے ہیں اور جس قدر عمل بڑھتے ہیں اسی قدر صعود بڑھتا ہے، گویا احناف کے یہاں تعلق جزو کل کا نہیں ہے بلکہ تعلق فرع و اصل کا ہے اور شوافع نے تعلق جزو کل کا رکھا ہے یعنی جس طرح شاخیں درخت کا جز ہوتی ہیں اسی طرح اعمال صالحہ بھی ایمان کا جز ہیں۔

بضع وستون کا مطلب بعض روایات میں بضع وستون کی جگہ بضع وسبعون ہے اور ایک روایت میں ـ اربع و سبعون ـ ہے اور بھی بعض روایات ہیں جن میں ضعیف و قوی سب ہی شامل ہیں، امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد بظاہر بیان تکثیر ہے تعداد نہیں ہے کبھی کبھی عدد کو تکثیر کے لئے بھی لاتے ہیں اور یہاں ـ بضع ـ کا مبہم لفظ استعمال کرنا بھی اسی طرف مشیر ہے

اہل لغت نے ـ بضع ـ کے مختلف معانی بیان کئے ہیں، کسی نے کہا اسکا اطلاق تین اور نو کے درمیانی اعداد پر کیا جاتا ہے، کسی نے کہا کہ اس کا اطلاق ایک اور چار کے درمیانی اعداد پر ہوتا ہے، بہر کیف مفہوم معین نہیں ـ بلکہ ابہام بدستور باقی ہے، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ تکثیر مقصود ہے، اور علامہ طیبی رحمہ اللہ کا مختار بھی یہی ہے

بعض حضرات نے اسے تحدید پر محل کیا ہے، انہیں اس سلسلہ میں کئی دقتیں پیش آئی ہیں پہلی بات تو یہ کہ بعض احادیث میں ـ ستون ـ ہے اور بعض میں ـ سبعون ـ اس تعارض کے رفع کے لئے ان کو کہنا پڑا کہ ہوسکتا ہے جب پہلی بار فرمایا ہو تو ـ ستون ـ ہی ہو لیکن جب دوبارہ فرمایا ہو تو شعبوں میں کچھ اضافہ ہوگیا ہو یا یہ کہا جائے کہ جب دو عدد ہیں تو زائد کو لیا جائیگا کیونکہ زائد میں ناقص بھی شامل ہوتا ہے اور

بَاب اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ ۔ حَدَّثَنَا آدَمُ بْنُ اَبِیْ اِيَاسٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِی السَّفَرِ وَاِسْمٰعِيْلَ عَنِ الشَّعْبِیِّ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَی اللّٰهُ عَنْهُ ــــ قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ وَقَالَ اَبُوْ مُعَاوِيَةَ حَدَّثَنَا دَاؤُدُ عَنْ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَمْرٍو عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، وَقَالَ عَبْدُ الْاَعْلٰی عَنْ دَاؤُدَ عَنْ عَامِرٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ــــ

ترجمہ ۔ باب ، مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں ــــ آدم بن ابی ایاس نے حدیث بیان کی کہ شعبہ نے عبداللہ بن ابی السفر اور اسماعیل کے طریق سے بواسطہ شعبی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی یہ روایت نقل فرمائی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں اور مہاجر وہ ہے، جس نے ان کاموں کو چھوڑ دیا جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے ــــ

ــــ ابوعبداللہ نے کہا اور ابومعاویہ نے کہا کہ داؤد نے عامر شعبی سے حدیث بیان کی اور عامر نے کہا کہ میں نے عبداللہ بن عمرو سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا ، ــــ اور عبدالاعلیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بسند داؤد عن عامر عن عبداللہ بیان کیا

الفاظ ترجمہ میں امام کا تفنن | اب ان ابواب ایمانیہ میں امام بخاری رحمہ اللہ مختلف قسم کے ابواب پیش فرما رہے ہیں ، اور پیش فرمانے کا طریقہ بھی عجیب و غریب ہے ۔ جسے دیکھکر حیرت ہوتی ہے ، ایسا نہیں فرماتے کہ فرائض کے درجہ کے اعمال کو ابتدا میں بیان فرما دیں اور پھر درجہ بدرجہ تنزل کے ساتھ دوسرے اعمال کا ذکر کریں ، اسی طرح ان اعمال کو کبھی ــــ من الاسلام ــــ اور کبھی ــــ من الایمان ــــ فرماتے ہیں ۔ نیز یہ کہ خبر کو کہیں مقدم ذکر کرتے ہیں اور کہیں مؤخر ــــ

ان تمام چیزوں کو محض اتفاقی بھی کہا جا سکتا ہے ، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ امام کا تفنن ہے کیونکہ ایک ہی تعبیر کے تکرار سے سامعہ اکتا جاتا ہے ۔ اور جب تعبیرات بدلتی رہتی ہیں تو طبیعت کا نشاط بڑھتا رہتا ہے ، اس لئے اس تعبیر کے فرق کو تفنن پر حمل کرنا بہتر ہے پھر صرف تفنن ہی پر بس نہیں بلکہ ہر موقعہ پر اس کے لئے مناسب وجہ بھی تلاش کی جا سکتی ہے

نظر ڈالی کہ صرف ان اعمال کو گنا جن پر ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے تو تعداد کم رہی پھر قرآن کریم کے ان اعمال کو گنا جن پر ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے تو تعداد کم رہی، پھر قرآن کریم اور حدیث کے اعمال کو ملا دیا اور مکررات کو حذف کر دیا تو ان کی تعداد کچھ اوپر ستر ہی نکلی۔

ابن حبان کے اس طریقہ کی طرف امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اشارہ فرمایا ہے کیونکہ ـــ باب امور الایمان ـــ کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ اس آیت کو پیش فرمایا ہے جس میں چند اعمال پر ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے پھر حدیث بھی اسی شان کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امور ایمانیہ کے شمار کا اسلم طریقہ یہ ہے کہ پہلے قرآن کریم پر نظر ڈالی جائے کہ قرآن نے کن امور کو منجملہ ایمان کہا ہے، اسی طرح پیغمبر کی سنت کا تتبع کیا جائے، اور بس انہیں امور کو، امور ایمان، کہا جائے، جن کو قرآن وسنت نے ایمان یا اسلام بتلایا ہے علامہ کشمیری رحمہ اللہ بھی اسی طریق عمل کو اچھا شمار کرتے تھے۔

تشریح حدیث | حدیث شریف میں حیا کو ایمان کا ایک شعبہ قرار دیا گیا ہے اور جملہ۔ الحیاء شعبۃ من الایمان۔ میں شعبہ کی تنوین تعظیم کے لئے ہے حیا، طبیعت کے انکسار اور انفعال کا نام ہے جو کسی ایسے خیال یا فعل کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے جسے عرفا یا شرعا مذموم سمجھا جاتا ہو، ایسا کام نہ کرنا چاہیئے کہ جس سے شرعا سبکی ہو اسی کا نام حیا، شرعی ہے جو انسان کو خدا کی اطاعت اور حقوق کی ادائیگی پر آمادہ کرتی ہے، برے کاموں سے روکتی ہے اسی لئے کہتے ہیں۔

الحیاء خیر کلہ	حیا، خیر ہی خیر ہے
اور۔ الحیاء خیر لا یاتی الا بخیر	حیا، صرف خیر کی چیز ہے جو خیر ہی کو لاتی ہے

یہ حیا، در اصل فطری شئے ہے اور ایمان کا سرچشمہ ہے، جو اخلاق حسنہ ایمان کے لئے مبادی کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں حیا، بھی ہے جب انسان اپنے وجود اور اپنی صفت کمال پر غور کرتا ہے جن پر انسان کی حیات کا دار ومدار ہے اور جن پر انسانی زندگی گھومتی ہے تو انسان کو خداوند قدوس پر ایمان لانا پڑتا ہے

ان احسانات عظیمہ، ظاہرہ وباطنہ کا کوئی شمار نہیں ہے جو خداوند قدوس نے انسان پر فرمائے ہیں اگر انسان، ان انعامات کے عرفان وایقان کے باوصف بھی خداوند قدوس کی ذات پر ایمان نہیں لاتا تو یہ اس کی سب سے بڑی بے حیائی ہے

گویا ان احسانات عظیمہ پر ایمان لانا بھی حیا، کا نتیجہ ہے، یعنی حیا، پہلے ایمان کا مبدا بنتی ہے اور ایمان لانے کے بعد پھر اسے تقویت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ انعامات کا پیہم شکریہ ادا کرنا بھی حیا ہی کا نتیجہ ہے اس بنا پر۔ الحیاء شعبۃ عظیمۃ۔ کہنا درست ہے

یہ شان موجود نہ ہو اسے یہ دعویٰ زیب نہیں دیتا۔

اور اگر صلح کل نہیں ہے تو کم از کم ان لوگوں سے تو خیر خواہی اور خیر اندیشی کا علاقہ ہو جن کے ساتھ رشتۂ اخوت اسلام قائم ہے۔ اور اگر یہ بھی نہیں ہے تو اسلام کا لقب تمہارے لئے ننگ وعار ہے، جب اشتقاقی معنی ہی موجود نہیں ہیں تو پھر آگے کیا امید ہو سکتی ہے۔

— من سلم المسلمون — کی قید سے یہ معنی نکالنا درست نہیں ہے کہ غیر مسلم سے رواداری جائز نہیں بلکہ مسلمان سب کا خیر اندیش ہوتا ہے، وہ نسب یا خاندانی برادری کو تلاش نہیں کرتا، اگر کسی کے ساتھ مذہبی یا نسبی رشتہ نہیں ہے تو انسانی علاقہ ان مراعات کے لئے کافی ہے ایک دوسری روایت میں من امنہ الناس۔ (جس سے سب لوگ محفوظ رہیں) کے الفاظ آتے ہیں

غرض اسلام ہی کا تقاضا ہے کہ بلا وجہ کسی غیر مسلم پر دست درازی نہ کریں، کافر ذمی تو المسلمون ہی میں آگیا کیونکہ ارشاد فرمایا گیا

دماء ھم کد مائنا ان کی جانیں ہماری جانوں کی طرح ہیں

رہا کفار کا معاملہ تو حرب وضرب کے موقعہ پر توکسی قسم کا خیال مقصد کے خلاف ہے اس لئے وہاں تو ضرر رسانی کی تابمقدور کوشش ہوگی اور اگر کافر حربی سے صلح ہے تو وہاں بھی اس کی اجازت نہ ہوگی اس سلسلہ میں ہمارے سامنے پیغمبر علیہ السلام کا عمل ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تو کم از کم مسلمانوں کے ساتھ تو خیر خواہی کا تعلق ہونا چاہیئے

اس موقعہ پر یہ شبہ بھی درست نہیں ہے کہ صرف دوسروں کے لئے خیر اندیش ہونا مسلمان ہونے کے لئے کافی ہے اور اس صفت کے بعد دوسرے اسلامی شعار کا ہونا ضروری نہیں یعنی نہ نماز کا ہونا ضروری ہے اور نہ دوسرے ہی فرائض کی ضرورت ہے ______ درست اس لئے نہیں کہ اس حدیث میں تو صرف لفظ مسلم کی لاج بیان کی گئی ہے کہ اگر تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو تو تمہیں اس لقب کا پاس و لحاظ رکھنا چاہیئے۔ گویا اسلامی احکام قبول کرنے کے بعد اس کے ساتھ ایک اور نشان بتلایا گیا ہے، یہ اسی طرح ہے جیسے شریعت میں منافق کی پہچان بتلائی گئی ہے

اذا حدث کذب واذا عاھد غدر — جب بات کرے جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے وعدہ خلافی کرے

۱۔ بخاری باب علامۃ المنافق ص۱۰

مسلم کی یہ پہچان اس لئے بتائی گئی ہے کہ جاہلیت میں کوئی شخص کسی کی طرف سے مطمئن نہ ہوتا تھا جب ایک دوسرے کا سامنا ہوتا تو خدشہ ہوتا کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے، اسی لئے باقاعدہ حلف لئے جاتے تھے، دشمنی عام

یہاں ترجمہ کے الفاظ — المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ — ہیں، یہ الفاظ امام رحمۃ اللہ کی ذیل میں تخریج کردہ حدیث کا جز ہیں، اور چونکہ پیغمبر علیہ السلام نے اس صفت کے ساتھ — المسلم — کا لفظ استعمال کیا ہے اس لئے امام بخاری رحمۃ اللہ نے بھی یہی عنوان اختیار فرمایا اس طرح الفاظ حدیث کا اتباع ہو جاتا ہے کہ جہاں حدیث میں اسلام کا لفظ ہے وہاں لفظ اسلام اور جہاں لفظ ایمان ہے وہاں لفظ ایمان استعمال کیا جائے۔

عام طور پر اہل علم اس کے معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ پورا مسلمان وہی ہے جس کے زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں، گویا المسلم کی تقدیر — المسلم الکامل — نکلی، لیکن علامہ کشمیری رحمہ اللہ اس توجیہ کو اچھا نہ سمجھتے تھے کہ اس طرح بات ہلکی پڑ جاتی ہے بلکہ اصول بلاغت میں یہ مسلم ہے کہ جب کسی چیز کو اونچا دکھلانا چاہتے ہیں تو اس پر جنس کا اطلاق اس طرح کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ جنس اسی فرد میں منحصر ہے، اب معنی یہ نکلے کہ مسلمان کہلانے کا حق اسی کو ہے جسکے ہاتھ اور زبان مسلمانوں کی ایذاء میں استعمال نہ ہوں گویا اطلاق میں مسلم کا لفظ اسی صفت کے ساتھ متصف انسان پر خاص کر دیا گیا، اس لئے وہ لوگ جو اس صفت کے ساتھ متصف نہیں ہیں اس شریف لقب کے مستحق نہیں۔ قاعدہ ہے کہ فرد اکمل کے مقابلہ پر فرد ناقص کو معدوم قرار دیا جاتا ہے جیسے — الرجل زید — زید ہی صحیح معنی میں رجل ہے یعنی زید میں رجل کی صفات اس درجہ میں موجود ہیں کہ اس کے مقابل دوسرے کو رجل کہنا ہی درست نہیں عرب کہتے ہیں — المال الابل — کیونکہ ان کے نزدیک ابل ہی اکرم الاموال ہے یا جیسے — الکرم فی العرب — یعنی صفت کرم میں عرب کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اسی طرح مسلم بھی یہاں اسی شخص کو کہیں گے جو اس صفت سے متصف ہو

تشریح حدیث | پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس سلسلے میں جسقدر تراجم ہوں گے ان کا بیشتر رخ مرجیہ کی تردید کی طرف ہوگا، کیونکہ انہوں نے ایمان میں نہ معصیت کو مضر سمجھا نہ اطاعت کو ضروری، اس لئے ہر وہ چیز جس کی مسلمان کو ضرورت ہو یا ہر وہ عمل جس سے ایمان میں کمزوری آئے مرجیہ کی تردید کے سلسلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

حدیث شریف کا مقصد یہ ہے کہ جب تم مسلمان ہو تو تمہارے اندر اسلام کی کوئی شان تو نمایاں ہونی چاہیئے۔ کم از کم مسلمان ہونے کی حیثیت سے سلامت روی اور سلامت جوئی تو ہونی ہی چاہیئے جو لفظ اسلام کا ماخذ اشتقاق ہے، اور اگر یہ بھی نہیں ہے تو پھر اسلام ہی کیا، کیونکہ اسلام کا ماخذ سلم ہے اور اس کے معنی صلح جوئی خیرخواہی اور مصالحت کے ہیں، پھر جس شخص میں ادعاء اسلام کیا وصف

جبر وقوت کو شامل ہے

دوسرا جملہ —— المھاجر من ھجر مانھی اللہ عنہ —— مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے — مطلب یہ ہے کہ ہجرت صرف ترک وطن کا نام نہیں ہے، یا یہ کہ ترک وطن اپنے اندر ذاتی خوبی نہیں رکھتا، بلکہ ترک وطن اس لئے ہے کہ ہم اس کے بغیر خداوند قدوس کے احکام کی پابندی نہیں کرسکتے، اور جس وطن میں احکام الٰہی کی تعمیل نہ ہوسکے اسے خیر باد کہنا ہی بہتر ہے۔

گویا ہجرت کی دو قسمیں ہیں، ظاہری، باطنی، ظاہری ہجرت ترک وطن ہے اور حقیقی ہجرت منہیات سے احتراز ہے اور اگر تارک وطن بھی منہیات کو نہ چھوڑے تو یہ بہت بری بات ہے۔ بایں معنی اس جملہ میں مہاجر کو تنبیہ بھی ہوسکتی ہے کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ ہجرت کے بعد کسی عمل خیر کی ضرورت نہیں کیونکہ قرآن کریم میں مہاجرین کی مدح وستائش کی گئی ہے

اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب فتح مکہ کے بعد ہجرت منسوخ ہوگئی اور آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمادیا

لا ھجرۃ بعد الفتح ولکن جھاد ونیۃ (بخاری کتاب الجہاد صہ۴۹)	فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے، لیکن جہاد اور نیت باقی ہے

اور پھر اس کے بعد متاخر الاسلام مسلمانوں کو افسوس ہوا کہ ہم پہلے کیوں نہ مسلمان ہوئے یہ فضیلت بھی حاصل ہوجاتی، تو اس کی تلافی کے لئے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

المھاجر من ھجر مانھی اللہ عنہ[1]	مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑدے جن سے اللہ نے منع کیا ہے

بایں معنی یہ تسلی ہے کہ اصل مہاجر تو یہ ہے جو گناہوں کو چھوڑ دے۔ اصل ہجرت شیطان کے مقابل ہے، ایک شخص نے ہجرت کے بارے میں آپ سے دریافت کیا۔ تو ارشاد فرمایا

ویحك ان شان الھجرۃ شدید[2]	تیرا برا ہو، ہجرت کا معاملہ نہایت اہم ہے۔

یہ خیال نہ کرو کہ میں ہجرت ہی کروں بلکہ جہاں بھی رہو عمل خیر کرتے رہو سات سمندر پار رہو اور اچھے اعمال کرو تو وہی اجر ملے گا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں

فاعمل من وراء البحار فان اللہ لن یترك من عملك شیئا[3]	پس تم سمندر کے اس پار بھی عمل کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے کسی عمل کو ضائع نہ کرے گا

غرض ہجرت مقصود اصلی نہیں ہے بلکہ مقصد خداوند قدوس کی اطاعت ہے، اگر انسان اپنی جگہ رہتے ہوئے اطاعت نہ کرسکے تو اس پر ایسی جگہ جانا لازم ہوجاتا ہے جہاں اطاعت خداوندی بجا لاسکے، گویا انسان اگر اپنی

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد صہ۳۳۳ ۱۲ [2] ایضا ۱۲ [3] ایضا ۱۲

بھی جس کا اثر قتل نفس ، ہتک محارم اور سرقِ اموال کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا ، اسلام نے اس مسموم فضا میں سانس لینے کے لئے السلام علیکم کا خطاب عام کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کے حق میں خیر اندیش اور طالب امن ہوں ، اور پھر دوسرے انسان پر اس کا جواب بھی ۔ وعلیکم السلام ۔ کی صورت میں واجب قرار دیا یعنی میں بھی آپ کے لئے طالب امن ہوں ، اور اسی بنا پر یہ پہچان بھی مقرر کردی کہ مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں

اس پہچان کے ایک یہ بھی معنی ہیں کہ مسلمان وہ ہے جسے لوگوں کا اسلام اس پر آمادہ نہ کرے کہ وہ دست زنی یا زبان درازی کرے ۔ اب اگر کوئی مسلمان کسی انسان کے متعلق کسی دوسری حیثیت سے کوئی بات کہتا ہے یا کسی اور مقصد سے دست درازی کرتا ہے تو وہ اس حکم ہی میں داخل نہیں ہے اس لئے کہ اس کا منشا غضب اس وقت اسلام نہیں ہے ، مثلاً ہم کسی کو فاسد العقیدہ جانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اسکی تعلیم اور صحبت غیر اسلامی ہے ۔ پاس بیٹھنے والوں پر اس کے اثرات خراب پڑتے ہیں اور لوگ اس کے گرویدہ بھی ہیں ۔ اب اگر ہم اپنے لوگوں کو سنبھالنے اور اس کی غلط صحبت سے بچانے کے لئے اس کے عقائد اور اسکی غلط اثر ڈالنے والی صحبت کا تذکرہ کریں ۔ عملی گندگی ظاہر کریں تو اس کو غیبت اور زبان درازی نہیں کہیں گے

اسی طرح کسی مقصد حسن کے پیش نظر اگر کسی مسلم کو سزا دی جائے ، مثلاً کوڑے لگائے جائیں یا رجم کیا جائے ، تو اگرچہ یہ بظاہر ایلام ہے ، لیکن مقصد ایلام نہیں ہے بلکہ فساد فی الارض اور فواحش کا سدباب منظور ہے اس لئے اس کو ممنوع نہیں قرار دیا جائیگا ۔

زبان اور ہاتھ کی تخصیص کی وجہ | حدیث شریف میں ایذا رسانی کے سلسلہ میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ایک لسان اور ایک ید ، کیونکہ ایذا کا تعلق اکثر انہیں دو سے ہوتا ہے ۔ ورنہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پیر کے ذریعہ ایذا رسانی میں کوئی مضائقہ نہیں ہے ، بلکہ مقصد یہ ہے کہ مطلق ایذا رسانی جرم ہے ۔ پھر ان دونوں میں بھی ید سے لسان کو مقدم کیا گیا ہے ۔ کیونکہ ضرر کا تعلق ید کے مقابلہ پر زبان سے زیادہ ہوتا ہے ۔ کیونکہ اول تو اس میں کچھ کرنا نہیں پڑتا ، صرف زبان ہلانی پڑتی ہے اور ضرر زیادہ پہونچ جاتا ہے ، صرف ایک ہی کلمہ کے ذریعہ پورے عالم کو نقصان پہونچایا جاسکتا ہے اور ہاتھ سے صرف اسی شخص کو نقصان پہونچایا جاسکتا ہے جو حاضر ہو اور زبان کے ذریعہ حاضر ، غائب ، گذشتہ اور آئندہ سب ہی کو ضرر پہونچایا جاسکتا ہے

نیز یہ ۔ لسان ۔ کا لفظ قول سے بھی عام ہے ، اس میں سب وشتم ، غیبت اور بہتان بندی کے ساتھ منہ چڑانا بھی داخل ہے اور قول صرف زبان کے کلمات ہی کو شامل ہے ۔ اسی طرح اور دوسرے اعضاء بدن کو چھوڑ کر ید کا ذکر فرمایا ، اس لئے کہ یہ لفظ مطلق قوت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس اعتبار سے یہ ہر

تشریح حدیث شریف کے الفاظ ہیں — المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده — جس کا ترجمہ یہ ہے کہ مسلمان وہی سمجھا جائیگا جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ نہیں ہیں تو وہ مسلمان نہیں ہے اس شبہ کے رفع کے لئے امام بخاری رحمۃ اللہ نے یہ دوسرا باب منعقد فرمایا کہ اسلام کے اندر درجات ہیں اور یہ درجات ایک دوسرے سے افضل ومفضول کا علاقہ رکھتے ہیں ، اسی لئے وہ مسلم جو تمام اسلامی چیزوں کے ساتھ اس نشان کا بھی حامل ہو افضل ہے ۔

اور چونکہ مصنف رحمۃ اللہ کے نزدیک اسلام اور ایمان ایک ہی ہیں اس لئے جب اسلام میں افضل ومفضول مراتب قائم ہوں گے تو ایمان میں بھی ان درجات کا ثبوت ہوجائیگا ۔ اور امام کا مقصد بھی یہی ہے کہ مرجیہ کی تردید کے لئے ایمان میں اعمال کی تاثیر کا اثبات کیا جاسکے

یہاں ——— ای ——— کی اضافت اسلام کی طرف ہورہی ہے جو مفرد ہے ، حالانکہ — ای — کی اضافت مفرد کی طرف درست نہیں ۔ اس لئے شارح نے تقدیر نکالی ہے — ای ذوی الاسلام افضل — اور اس تقدیر کے لئے قرینہ یہ ہے کہ جواب میں بھی صاحب اسلام کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کی تائید دوسری روایت کے الفاظ ——— ای المسلمین افضل — سے ہورہی ہے ، اسی گذارش سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن شارح نے تقدیر — ای خصال الاسلام افضل — نکالی ہے درست نہیں ، کیونکہ جواب میں وصف کا ذکر نہیں موصوف کا ہے

اس اعتراض کا جواب کہ سوال میں صفت کا ذکر ہے اور جواب میں موصوف کا کرمانیؒ نے یہ دیا ہے کہ جواب کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ساتھ ہی علت بھی مذکور ہوجائے جیسے

یسئلونك ماذا ینفقون سپ۲ع۱ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کیا کریں

کا جواب ـــ

قل ما انفقتم من خیر فللوالدین والاقربین سپ۲ع۱ آپ فرما دیجئے کہ جو کچھ مال تم کو صرف کرنا ہو سو ماں باپ کا حق ہے اور قرابتداروں کا

سے دیا گیا ہے اسی طرح یہاں جواب میں خصلت کے ساتھ صاحب خصلت کا بھی ذکر ہے یعنی سلامتی اسلام کے خصال میں سب سے افضل ہے اور اسکی وجہ سے صاحب خصلت بھی افضل ہوجاتا ہے ، لیکن سوال وجواب میں بغیر کسی تاویل کے مطابقت کے لئے ——— ای ذوی الاسلام افضل ——— کی تقدیر سب سے افضل ہے

(کرمانیؒ جلد اول)

جگہ رہ کر بھی منہیات سے بچ سکے تو اس کو ہجرت کا مقصد حاصل ہے اگرچہ ہجرت نہیں کی

تعلیق کا مقصد یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے دو تعلیقات ذکر فرمائی ہیں پہلی تعلیق کے دو مقصد ہیں

(۱) ایک مقصد تو یہ ہے کہ عامر اور شعبی دونوں ایک ہی راوی سے عبارت ہیں، عامر نام ہے اور شعبی لقب ہے روایت کے اختلاف سے بادی النظر میں یہ شبہ ہوتا تھا کہ روایت دو شخصوں سے منقول ہے۔ ایک عامر سے اور دوسرے شعبی سے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے داؤد بن ابی ہند کے طریق سے یہ واضح کر دیا کہ عامر وہی شخص ہیں جو پہلی روایت میں آچکے ہیں۔

(۲) دوسرا مقصد یہ ہے کہ ابن مندہ کی روایت سے معلوم ہوتا تھا کہ شعبی نے براہ راست عبداللہ بن عمرو بن العاص سے نہیں سنا کیونکہ انہوں نے درمیان میں ایک رجل مبہم کا واسطہ ذکر کیا ہے۔ بخاری کی روایت سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شعبی نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے براہ راست سنا ہے کیونکہ حرف عن استعمال کیا گیا ہے جو اتصال اور انقطاع دونوں کے لئے مستعمل ہو سکتا ہے، اس لئے ابو معاویہ کے طریق سے اس شبہ کا ازالہ کر دیا، کیونکہ اس میں ۔ سمعت ۔ کی تصریح موجود ہے

دوسری تعلیق کا مقصد یہ ہے کہ عبدالاعلیٰ کے اس طریق میں جس میں عبداللہ کو غیر منتسب ذکر کیا ہے اس سے بھی عبداللہ بن عمرو بن العاص ہی مراد ہیں اس وضاحت کی ضرورت اس لئے پڑی کہ طبقۂ صحابہ میں جب عبداللہ مطلق ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مراد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوتے ہیں جس طرح طبقۂ تابعین میں مطلق عبداللہ سے حضرت عبداللہ بن مبارک مراد ہوتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس پر تنبیہ فرمانے کے لئے اس دوسری تعلیق کا ذکر کیا ہے

بَابٌ اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ حدثنا سَعِیْدُ بْنُ یَحْیٰی بْنُ سَعِیْدِ الْاُمَوِیُّ الْقُرَشِیُّ قَالَ ثَنَا اَبِیْ قَالَ ثَنَا اَبُوْ بُرْدَۃَ بْنُ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ اَبِیْ بُرْدَۃَ عَنْ اَبِیْ بُرْدَۃَ عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ قَالَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ

ترجمہ ۔ کونسا اسلام افضل ہے ــــــ سعید بن یحییٰ بن سعید اموی قرشی نے حدیث بیان کی فرمایا کہ میرے والد یحییٰ نے بیان فرمایا، کہ ہم سے ابو بردہ بن عبداللہ بن ابی بردہ نے حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے بروایت ابو بردہ یہ حدیث بیان فرمائی کہ صحابہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا ۔ یا رسول اللہ ! کونسا اسلام افضل ہے، آپ نے فرمایا جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں

ــــــــــــــــــــــــ

یہاں پانی ہی سے روکنا مقصود تھا، یہ لفظ بہت ہی جامع ہے۔ نیز یہ کہ آیت میں نہ لفظ کی کوئی قید ہے اور نہ اپنے اور پرائے کی کوئی تخصیص ہے بلکہ

کل من انضاف الی بیتک فہو ضیفک — جو بھی تمہارے گھر چلا آئے وہ تمہارا مہمان ہے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا عمل تھا کہ اگر سائل سائل کی شکل میں ہوتا تو اسے کچھ دیدیں اور اگر وہ مہمان کی شکل میں ہوتا تو اسے کھانا کھلاتی تھیں

دوسری بات زبان سے نفع رسانی کی ہے اس کے لئے۔ تقرء السلام — فرمایا کہ زبان سے سب وشتم کی اجازت نہیں ہے، یہاں بھی — تسلم — نہیں فرمایا، کیونکہ اس سے سلام کا طریقہ نہیں معلوم ہوتا اور اس تعبیر سے معلوم ہو رہا ہے کہ اسلام کا طریقہ لفظ سلام ہے جس سے پہلی ہی ملاقات میں دوسرے کو مطمئن کیا جا سکتا ہے، نیز — تسلم — میں دوسری کمی یہ ہے کہ اس سے اسلوب کتابت کی رہنمائی نہیں ہوتی۔ اسلام کے اس عمل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تعارف کی کوئی قید نہیں ہے، بلکہ جو بھی ملے اسی کو سلام کرو سلام کا معرفت کے ساتھ خاص ہونا قیامت کی علامت بتلایا گیا ہے

الفاظ حدیث پر ایک اصولی اشکال اور اس کا حل

اس موقعہ پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ احادیث شریفہ میں مختلف چیزوں سے سوالات وارد ہوئے ہیں کہیں — ای الاسلام افضل — ہے کہیں — ای الاسلام خیر — ہے اور کہیں — احب — کا لفظ استعمال کر رہے ہیں اور ان کے جواب میں بھی مختلف چیزیں وارد ہوئی ہیں، ان چیزوں میں بھی تقدم وتاخر کے سلسلہ میں اختلاف ہے، جس چیز کو ایک جگہ مقدم ذکر کیا گیا ہے وہ دوسری جگہ موخر کر دی گئی ہے، ایک ہی عمل کہیں سوال کے جواب میں ذکر کیا گیا ہے اور کہیں اس عمل کو بغیر کسی سوال کے ذکر کر دیا گیا ہے ——————— شبہ یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک عمل افضل ہے تو ہر جگہ اسی کا ذکر ہونا چاہئے، یہ بہ ظاہر درست نہیں معلوم ہوتا کہ ایک ہی عمل کو کہیں افضل قرار دیں اور دوسرے موقعہ پر اس عمل کو مفضول کہدیں اور اس کے بجائے کسی اور عمل کو افضل بتلائیں ———

اس اشکال کے مختلف جوابات دئے گئے ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ جوابات کا یہ اختلاف سوال کرنے والوں کے حالات کے اختلاف کا نتیجہ ہے، کیونکہ سائل کی حالت دیکھکر جواب دیا گیا ہے، مثلاً ایک شخص نے سوال کیا، کونسا عمل بہتر ہے اور اس کی یہ حالت ہے کہ نماز کا پابند ہے، روزے رکھتا ہے اور دوسرے تمام اعمال پر سختی سے عامل ہے لیکن طبیعت میں ذرا بخل ہے تو اس شخص کو ایسا عمل بتلایا جائیگا، جو اس کی کا علاج کر سکے، مثلاً کھانا کھلانا ——— ایک اور شخص ہے جو مہمان نواز ہے، رحمدل ہے لیکن نماز

بَابُ اِطْعَامُ الطَّعَامِ مِنَ الْاِسْلَامِ حدثنا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ يَزِيْدَ عَنْ اَبِي الْخَيْرِ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ الْاِسْلَامِ خَيْرٌ فَقَالَ تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَ تُقْرِءُ السَّلَامَ عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ

ترجمہ ۔ باب ۔ کھانا کھلانا اسلام میں داخل ہے ——— عمرو بن خالد نے حدیث بیان کی فرمایا کہ ہم سے لیث نے حضرت عبداللہ بن عمرو کی یہ روایت بسند یزید عن ابی الخیر بیان کی کہ کسی شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا ، کونسا اسلام خیر ہے ؟ آپ نے فرمایا ۔ کہ تم کھانا کھلاؤ اور سب کو سلام کرو عام اس سے کہ تم اسے پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو

تشریح | یہاں ترجمہ کے الفاظ میں عمل مقدم ہے اور — من الاسلام — مؤخر ، بظاہر تو تفنن عبارت ہے ، لیکن حقیقت الفاظ ہی سے واضح ہے ۔ اوپر دو چیزوں کا ذکر تھا ، ایک تو یہ کہ مسلمان کی شان یہ ہے کہ سب کا خیر اندیش ہو اور دوسرے یہ کہ کسی کو اس سے نقصان نہ پہونچے ، اب یہاں ایصال نفع کا ذکر ہے ۔ پہلے زبان اور ہاتھ کے نفع کا ترک تھا ، اور یہاں ان دونوں اعضاء سے نفع رسانی کا ذکر ہے اطعام الطعام ید کا فعل ہے اور اقراء السلام لسان کا ۔

ایک مسلمان کی شان یہی ہونی چاہیئے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کی حاجت روائی اور خیر خواہی کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے ۔ یہاں صیغہ مضارع — تطعم — کے استعمال میں اسی طرف اشارہ ہے کہ اس فعل کی عادت ہونی چاہیئے ۔ جو بھی حاجت مند ہو اسے کھانا کھلاؤ ۔ اسی تعمیم کے لئے مفعول بہ کو حذف کر دیا گیا ہے ۔ نیز یہ کہ اس میں یہ بھی مذکور نہیں ہے کہ پیٹ ہی بھر کر کھلائے یا اعلیٰ درجہ کا کھلائے بلکہ جسقدر بھی وسعت ہو اور جتنی بھی توفیق ہو جائے ۔ عرب کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ مہمان کی حیثیت کا جائزہ لیکر میزبانی کیا کرتے تھے ۔ تطعم الطعام ۔ کے الفاظ ایسے ہیں جو کھلانے ، پلانے اور چکھانے وغیرہ سب پر صادق آسکتے ہیں ۔ اگر کچھ بھی میسر نہیں ہے تو پانی پلا دو ۔ قرآن کریم میں اس لفظ کو پانی کیلئے استعمال کیا گیا ہے ۔ ارشاد ہے

ومن لم یطعمه فانه منی الامن اغترف غرفة بیده پ ۲ ر ۱۷	اور جو اس کو زبان پر بھی نہ رکھے وہ میرے ساتھیوں میں ہے مگر یہ کہ ایک آدھ چلو پیئے ۔

لیکن اس جواب پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب نوع اول کی فہرست کے تمام اعمال افضل کہلائے تو اب یہ ممکن نہیں ہے کہ یہی اعمال نوع دوئم میں بھی مذکور ہوں، یا اسی طرح جو اعمال نوع دوئم میں آگئے ہیں اب ان کا شمار بھی نوع اول میں نہیں کیا جاسکتا، حالانکہ ہم ایسا دیکھ رہے ہیں، کہیں جہاد کو نوع اول میں رکھا گیا ہے کہیں اس کا ذکر نوع دوئم میں کیا گیا ہے اور کہیں اس کو تیسرا درجہ دیا گیا ہے

اس اشکال کے بعد بظاہر امام طحاوی رحمۃ اللہ کا جواب کمزور ہوجاتا ہے لیکن امام طحاوی رحمۃ اللہ کی جلالت شان کے پیش نظر ہم اس میں اضافہ کرسکتے ہیں، یعنی ایک ایسی نوع کا اضافہ کردیا جائے جو ذوجہتین ہو، اس نوع میں ان اعمال کو داخل کیا جائے جو اپنے اندر مختلف حیثیت رکھتے ہیں کبھی ان کا ذکر نوع اول میں ہوگا اور کبھی نوع ثانی وثالث میں۔

اب ایک فہرست ان اعمال کی ہوگی جو صرف نوع اول میں رکھے جائیں گے، دوسری فہرست میں صرف نوع ثانی کے افراد ہوں گے اور ایک تیسری فہرست میں اس طرح کے افراد ہوں گے جو ایک حیثیت سے نوع اول اور دوسری حیثیت سے نوع ثانی کے افراد ہوں گے

اس کی وجہ یہ ہے کہ کلی طور پر فضیلت مجموعۂ شریعت کو حاصل ہے، اب جو فضیلت ایک فرد کو دوسرے فرد کے مقابل ہے وہ صرف جزئی ہے

چوتھا جواب یہ ہے کہ جوابات کا یہ اختلاف سوالات کے اختلاف کی وجہ سے ہے کہیں — ای الاسلام افضل — کہا گیا ہے کہیں — ای الاسلام خیر — کہا گیا ہے اور کہیں — ای الاسلام احب — کے الفاظ ہیں۔ ان تمام الفاظ میں باہم اختلاف ہے، جس کی وجہ سے جواب میں اختلاف ہوگیا ان الفاظ کے معانی میں اختلاف کے بیان کے لئے ہمیں ذرا تفصیل کی ضرورت ہوگی، ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اس سلسلہ میں حدیث شریف اور ارشادات نبوی سے کچھ روشنی ملتی ہے یا نہیں

ارشاد نبوی فضیلت اعمال کے سلسلہ میں ہمیں شریعت نے جامع اصول بتلا دیا ہے ارشاد نبوی ہے

افضل الاعمال احمزھا — اعمال میں سب سے افضل وہ عمل ہے جس میں دشواری ہو

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) اور یہ بھی کہ پیغمبر علیہ السلام کے ان ارشادات ہی سے ایک اصول زندگی یہ نکل رہا ہے کہ اگر تمہیں خداوند قدوس اصلاح عوام کی توفیق دے تو ہر شخص کے لئے ایک ہی عمل تجویز نہ کرو بلکہ ایسا عمل بتلاؤ جس کی اس شخص میں کمی ہو۔ کیونکہ ہر مریض کے لئے ایک ہی نسخہ کارگر نہیں ہوتا۔ جب ان ارشادات سے ایک اصول زندگی نکل رہا ہے تو یہ کہنا کہ ان میں صرف انفرادیت کی شان ہے درست نہیں

کے معاملہ میں کوتاہ ہے، وہ سوال کرتا ہے تو کہا جائے گا

الصلوٰۃ لوقتہا — نماز کا وقت پر ادا کرنا

پیغمبر علیہ السلام روحانی معلم ہیں، جس عمل کی کمی دیکھتے ہیں اسی کی ترغیب دلاتے ہیں [ملہ]

دوسرا جواب یہ ہے کہ جوابات کا یہ اختلاف، زمانہ کے اختلاف سے پیدا ہوا ہے، مثلاً ہجرت کے بعد کسی نے سوال کیا کہ کونسا عمل بہتر ہے تو فرمائیں گے مہاجرین کی خدمت، دوسرے وقت جہاد کا موقع ہے تو اس وقت سب سے بہتر عمل جہاد کو بتلایا جائیگا

تیسرا جواب امام طحاوی رحمۃ اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کسی ایک روایت کے پیش نظر یہ فیصلہ نہ کیا جائے کہ اس عمل کو دیگر تمام اعمال پر کلی افضلیت حاصل ہے، اسی طرح مفضول اعمال کا معاملہ ہے کہ انہیں بھی کلی طور پر مفضول نہ سمجھا جائے بلکہ انسب یہ ہے کہ تمام روایات پر نظر کی جائے اور ان میں جن جن اعمال کو افضل قرار دیا گیا ہے ان سب کو ایک ہی نمبر میں لے آیا جائے اسی طرح دوسرے اور تیسرے نمبر کے تمام اعمال کو ایک نوع کی صورت دیدی جائے، اس طرح افضل اور مفضول اعمال ایک فرد میں منحصر نہ ہوں گے بلکہ ان کی ایک نوع ہو جائے گی اور کہا جائیگا — من افضل الاعمال ھذا و من افضل الاعمال ھذا — گو اس کے باوجود بھی نوع کے افراد میں مراتب تسلیم کرنے ہوں گے، کہ نوع اول ہی میں یہ عمل دوسرے فلاں عمل سے افضل ہے

ملہ اس موقعہ پر ایک طالب علم نے سوال کیا۔ حضرت! پیغمبر علیہ السلام کے تمام ارشادات پوری امت کے لئے ایک اصول زندگی کا حکم رکھتے ہیں، اس لئے اس بارگاہ میں کسی انفرادی حیثیت یا کسی خاص شخص کی رعایت کا سوال درست نہیں معلوم ہوتا ——— اور بالخصوص جبکہ سوال مجمع میں ہو تو وہاں اجتماعیت کا زیادہ اہتمام ہونا چاہئے۔

حضرت مدظلہم نے ارشاد فرمایا کہ درست ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ جس مجمع میں سوال ہو رہا ہے اس پورے مجمع میں اس عمل کی کوتاہی ہو مثلاً جس مجمع میں

من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ — مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں

فرمایا ہے وہ پورا مجمع باہمی اختلاف رکھتا ہو، اور ان لوگوں کو ایک دوسرے کا خیرخواہ اور پشت پناہ بنانے کی ضرورت ہو۔ اگر یہ صورت درست ہو سکتی ہے تو اس میں اجتماعیت کی پوری رعایت موجود ہے

(بر صفحۂ آئندہ)

فی الارض یا انسانیت کا خون نہیں ہے ۔ بلکہ انسانیت کو صراط مستقیم کی ہدایت مقصود ہے

جہاد کی مشقت بھی معمولی نہیں ہے ، انسان سر سے کفن باندھکر گھر سے نکلتا ہے کہ اب کسی سے ملاقات نہ ہوسکے گی ، جب انسان زندگی سے ہاتھ دھونے کی قسم کھالیتا ہے تب یہ اقدام کرتا ہے لیکن ان تمام تر مشقتوں کے باوجود اس کی مشقت ایمان باللہ سے کم ہے

اس کے بعد تیسرے نمبر پر روایات میں حج کا ذکر ہے ، حج میں بھی انسان کو ہر طرح کی قربانی دینی پڑتی ہے ، جان . مال ، اور ترک وطن سب ہی چیزوں کے بارے میں قربانی دینی پڑتی ہے ، گویا انسان کو جتنی چیزیں بھی مرغوب ہیں سب سے یک قلم منہ موڑنا پڑتا ہے ، انسانوں کا ایک سمندر ہے لیکن حاجی کو اس پورے مجمع کے درمیان رہتے ہوئے سب سے الگ رہنا پڑتا ہے ، اسی مشقت کے باعث جب عورتوں نے جہاد کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے فرمایا

جهادكن الحج ۔ تمہارا جہاد حج ہے

یہ معاملہ فضیلت اعمال کا تھا جس میں مشقت اور تعب کا اعتبار ہے ،

اس کے بعد دوسرا معاملہ احبیت اعمال کا ہے ، احبیت کے متعلق اصول یہ ہے کہ وہ عمل اللہ کے نزدیک محبوب ہوگا جس سے خدا اور بندے کے درمیان کا علاقہ مضبوط ہو ، خدا اور بندے کے درمیان آقائی اور غلامی کا علاقہ ہے ۔ غلام وہی اچھا ہوتا ہے جس کا سر آقا کے سامنے ہمیشہ جھکا رہے اور جو آقا کے ہر حکم کو بے چون وچرا تسلیم کرلے ، اس حیثیت سے اعمال پر نظر ڈالتے ہیں تو نماز سب سے احب ہونی چاہیے جب بندہ یہ سوچتا ہے کہ مجھے دربار احکم الحاکمین میں جانا ہے تو پہلے وضو کرتا ہے ، مقصد یہ ہے کہ میں اس گندگی کے ساتھ حاضری کے لائق نہیں ہوں ، اس لئے حاضری سے پہلے ظاہر و باطن کو صاف کرلینا چاہیے اور پھر اس صفائی کے بعد ہاتھ باندھکر سر جھکا کر کھڑا ہوجاتا ہے ، جسم کا عضو عضو سراپا تواضع ہے زبان محو ثنا ہے ، اس تواضع کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ سر بھی پیروں پر رکھدیتا ہے ۔ اور جب ایک سجدہ قبول فرمالیا جاتا ہے تو شکریہ میں فوراً دوسرا سجدہ کرتا ہے

غرض نماز عبد و معبود کے درمیان گہرا رشتہ قائم کرتی ہے ، ادھر سے بندہ

الحمد لله رب العالمين ۔ تمام تر تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو ہر ہر عالم کے مربی ہیں

کہتا ہے ، تو ادھر سے رب العالمین

حمدنی عبدی ۔ میرے بندے نے میری تعریف کی

فرماتا ہے ، پھر بندہ

(۱ بخاری شریف جلد اول)

اور اجرکم علی قدر نصبکم تمہارا اجر تمہاری مشقتوں کے اعتبار سے ہے

ان ارشادات کی روشنی میں ہم اعمال کی فضیلت معلوم کر سکتے ہیں بعض اعمال ایسے ہیں جنہیں سب ہی اچھا سمجھتے ہیں اور ان کے کرنے میں بھی کوئی مشقت نہیں ۔ جیسے خوش اخلاقی سے گفتگو ، یا راستہ میں سے کانٹے صاف کر دینا کہ کہیں کسی غفلت شعار انسان یا نابینا کو تکلیف نہ ہو ، یہ اعمال ایسے ہیں کہ ان کے کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ، اور ان کو سب ہی کے نزدیک اچھا بھی سمجھا جاتا ہے ، اور ایک وہ اعمال ہیں جن کے کرنے میں انسان کو تکلف ہوتا ہے اور کچھ نہ کچھ مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے

شریعت نے ہمیں ایک اصول بتلا دیا کہ عمل میں جس قدر مشقت ہوگی اسی قدر ثواب دیا جائے گا ، یہ اصول جب ہمارے سامنے آگیا تو اب اعمال کی فضیلت کا پتہ بھی لگایا جا سکتا ہے

ہم دیکھتے ہیں کہ ایمان باللہ ، جہاد ، اور نماز کے اندر مشقت ہے ، اور بہت مشقت ہے ، ایک کافر کے لئے ایمان قبول کر لینا جان دینے سے زیادہ دشوار ہے ، مثال کے لئے کفار مکہ کو دیکھ لیجئے ، ایمان باللہ کے سوا اور کچھ تو ان سے مطلوب نہ تھا ، لیکن انہوں نے اس خیال سے کہ آبائی دین پامال نہ ہو طرح طرح کی قربانیاں دیں ، جنگ ہوئی اور متعدد بار ہوئی ، اعزا قتل کر دئے گئے ، خود ان لوگوں کو شہر بدر کر دیا گیا ، انتہا یہ ہے کہ وہ قتل بھی کئے گئے ، لیکن مذہب بدلنے کیلئے تیار نہ ہوئے ،

بالآخر جب تمام قوتیں صرف ہو گئیں اور یہ حضرات کامیابی سے مایوس ہو گئے تو ہتھیار ڈالدئے اور جس طرح کفر پر مضبوطی سے قائم تھے اسی طرح اسلام میں بھی جاں نثاری کا ثبوت پیش کیا ، ارشاد ہے

خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاسلام اذا فقھوا (بخاری کتاب المناقب ص۴۹۶) ان میں جو لوگ دورِ جاہلیت میں منتخب تھے وہ اسلام میں بھی منتخب ہیں اگر تفقہ فی الدین حاصل کریں

چونکہ ایمان باللہ سب سے مشکل کام ہے ، اس لئے سب سے پہلے اسی کا ذکر کیا ، اس کے بعد دوسرا نمبر جہاد کا ہے ، جب اسلام قبول کر لیا تو اب ہر طرح اس کی اشاعت کے لئے کوشش ہونی چاہیئے ، دشمن کتنی بھی کوشش کریں مگر انہیں پسپا کرنا چاہیئے ، دشمن ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں ، اول نہار میں اسلام اور آخر نہار میں کفر اختیار کرتے ہیں تاکہ سادہ لوح مسلمانوں کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہو کہ اگر ان اساطین ملک و ملت کو اسلام سے عناد ہوتا تو اسے قبول ہی کیوں کرتے ، یہ جو قبول اسلام کے بعد گریز کر رہے ہیں ، معلوم ہوتا ہے کہ ضرور اس دین کا باطن ظاہر سے مختلف ہے ——— غرض جب کفار کی جانب سے ہر طرح کی کوشش کی گئی تو بالآخر مدافعت کی اجازت دی گئی کہ اگر یہ لوگ تم پر حملہ آور ہوں تو دندان شکن جواب دو جس کا مقصد افساد فی

اس کے بعد احبیت کا دوسرا مرتبہ اس عمل میں ہے جس کا فائدہ عیال اللہ یعنی مخلوق خدا کو پہونچے، یعنی جس طرح عیالدار کو عیال کی پرواہ ہوتی ہے، اور یہ شخص ان حضرات کا شکرگزار ہوتا ہے جو ان پر احسان کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ شخص ان حضرات سے دشمنی مول لیتا ہے جو عیال کے مخالف ہوتے ہیں، یہ مخلوق اللہ کی عیال ہے جو حقوق ادا کرے گا وہ اللہ کے یہاں محبوب قرار دیا جائیگا اور جو مخلوق پر ظلم کریگا اسے یہ مرتبہ حاصل نہ ہوسکے گا، عام اس سے کہ وہ مخلوق انسان ہو، حیوان ہو جن ہو، اور خصوصاً وہ مخلوق جس کی تربیت کی ذمہ داری بھی کسی پر ڈالدی گئی ہو غرض مخلوق کے حقوق کی رعایت بھی احبیت کا باعث ہے

تیسرا لفظ ——— ای الاسلام خیر ——— ہے۔ وہ عمل خیر ہوگا جو تمام دنیا کی نظر میں اچھا ہو، یہاں خیر، شر کا تقابل ہے، اس لئے خیریت ان اعمال سے متعلق ہوگی جن میں شر بالکل نہ ہو اور یہ کہ شر جس قدر بھی سرایت کرتا جائے گا اسی قدر خیریت کم ہوتی چلی جائیگی، اور شر کی وہ قوتیں جو انسان کو تباہی و بربادی کی طرف لیجاتی ہیں صرف دو ہیں بخل اور کبر، یہ دونوں قوتیں انسان کو دنیا میں عزت اور آخرت میں جنت سے محروم کردیتی ہیں، کبر کے بارے میں ارشاد نبوی ہے

لا یدخل الجنۃ من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من کبر (مسلم باب تحریم الکبر ص۶۵)   وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا

اس لئے خیریت کے لئے کبر سے بعد ضروری ہے، کبر کے علاج کے لئے اسلام نے سلام کی تاکید کی کہ ہر مسلم کو سلام کرو، تمہیں یہ سوچنے کی گنجائش نہیں ہے کہ ہم بڑے آدمی ہیں، دوسرے آدمیوں کو چاہیئے کہ ہمیں سلام کریں۔ اسلام نے سنت جاری کی کہ تم ہر اس شخص کو سلام کرو جو ملے خواہ وہ جانا پہچانا ہو یا انجان ہو، غرض اسلام نے سلام کے ذریعہ کبر کا علاج کردیا کہ خداوند قدوس کو کسی کا کبر پسند نہیں ہے

دوسری مذموم صفت بخل ہے جس شخص میں یہ صفت ہوگی وہ کبھی دوسروں کے حقوق ادا نہیں کرسکتا، بیوی کا مہر ادا نہیں کرسکتا اولاد کو نفقہ نہیں دے سکتا، سائل کا حق ادا نہیں کرسکتا، مہمان کی مہمان داری نہیں کرسکتا، مسافرین کی اعانت نہیں کرسکتا، بلکہ ان مستحقین کے خلاف طرح طرح کے الزام قائم کرے گا تاکہ وہ مطالبہ بھی نہ کرسکیں

اس بخل کے مختلف درجات ہیں، ایک تو یہ کہ انسان دوسرے کی حق تلفی کرے، دوسرے یہ کہ اپنے حقوق کی ادائیگی میں بھی بخل سے کام لے۔ اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ دوسرے کسی انسان کو حق ادا کرتے دیکھ کر بھی تکلیف محسوس کرے، اس آخری درجہ کو شح کہا جاتا ہے، بخل کے متعلق حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے

ای داء ادوأ من البخل [۱]   کونسی بیماری بخل سے زیادہ مہلک ہے

فرمایا تھا، پورا واقعہ یہ ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

[۱] بخاری باب قصۃ عمان والبحرین ص۶۲۹ ج۲

الرحمن الرحیم — جو بڑے مہربان، نہایت رحم والے ہیں

کہتا ہے تو خداوند قدوس

اثنی علیّ عبدی — میرے بندے نے میری ثنا کی

فرماتا ہے، پھر بندہ

مالک یوم الدین — جو روزِ جزا کے مالک ہیں

کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ

مجد نی عبدی — میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی

فرماتا ہے، اور جب بندہ

ایاک نعبد وایاک نستعین — ہم آپ کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کرتے ہیں

کہتا ہے تو خداوند قدوس کی رحمت پکار اٹھتی ہے

ھذا بینی وبین عبدی ولعبدی — یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور

ما سأل — میرے بندے کیلئے وہ ہے جسکا اس نے سوال کیا

اور جب بندہ اعتراف نیازمندی کے ساتھ التجا کرتا ہے کہ ہر معاملہ میں ہمیں سیدھے راستہ پر چلا تو ارشاد ہوتا ہے

ھذا لعبدی ولعبدی ما سأل [1] — یہ میرے بندے کیلئے ہے اور اس کیلئے وہ ہے جسکا اس نے سوال کیا

---

[1] حدیث ملاحظہ ہو ـــــــــ عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلیّ صلوۃ لم یقرأ فیہا بام القرآن فہی خداج ثلثا غیر تمام فقیل لابی ھریرۃ انّا نکون وراء الامام قال اقرأ بہا فی نفسک فانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول قال اللہ تعالیٰ قسمت الصلوۃ بینی وبین عبدی نصفین ولعبدی ما سأل فاذا قال العبد الحمد للہ رب العالمین قال اللہ تعالیٰ حمدنی عبدی واذا قال الرحمن الرحیم قال اللہ تعالیٰ اثنی علیّ عبدی واذا قال مالک یوم الدین قال مجدنی عبدی واذا قال ایاک نعبد وایاک نستعین قال ھذا بینی وبین عبدی ولعبدی ما سأل فاذا قال اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین. قال ھذا لعبدی ولعبدی ما سأل ـ رواہ مسلم ـ (مشکوۃ شریف. باب القراءۃ فی الصلوۃ)

غیرہ شرہیں بالکل غلط ہے اور سفاہت پر مبنی ہے

بَابٌ مِنَ الْاِيْمَانِ اَنْ يُّحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ شُعْبَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ وَعَنْ حُسَيْنٍ الْمُعَلِّمِ قَالَ حَدَّثَنَا قَتَادَةُ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ

ترجمہ، باب ، یہ ایمان میں داخل ہے کہ اپنے بھائی کے لئے اسی چیز کو پسند کرے جسے اپنے لئے پسند کرتا ہے ــــــــ مسدد نے حدیث بیان کی فرمایا کہ یحییٰ نے شعبہ سے حدیث بیان کی اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بروایت قتادہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان فرمایا، ــــــــ اور حسین معلم سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ حضرت قتادہ نے حدیث بیان کی کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا کہ آپ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکیگا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے اس چیز کو پسند نہ کرے جسکو اپنے لئے پسند کرتا ہو

تبدیلی عنوان کی وجہ امام بخاری رحمہ اللہ اب عنوان بدل رہے ہیں، اس سے پہلے عنوانات میں "اسلام" کا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔ کیونکہ اطعام طعام وغیرہ ظاہری افعال ہیں جن کا تعلق اسلام ہی سے ہوسکتا ہے، پھر اسلام کے واسطے سے تعلق ایمان سے ہوگا۔ لیکن محبت فعل قلبی ہے، اس لئے اس کی تعبیر میں ایمان ہی کا لفظ اچھا ہے۔ اور پھر حدیث میں جس ترتیب سے دونوں لفظ واقع ہوئے ہیں اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ پہلے باب کا تعلق اسلام سے ہو، اور دوسرے میں ایمان کی تصریح ہو، کیونکہ پہلی حدیث میں ــــ ای الاسلام خیر ــــ کا جواب دیا گیا ہے اور یہاں ــــ لا یومن احدکم ــــ فرمایا گیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے دونوں چیزوں کی رعایت رکھی گو امام کے اس طرز کو تفنن سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے لیکن جب ایک بالکل واضح وجہ موجود ہے تو اسی کو اختیار کرنا مناسب ہے

اختلاف اسناد یہاں دو سندیں مذکور ہیں، ایک تو ــــ یحییٰ عن شعبۃ عن قتادۃ عن انس ــــ اور ــــ عن حسین المعلم قال ثنا قتادۃ عن انس ــــ دونوں سندوں میں شعبہ اور حسین معلم قتادہ سے راوی ہیں، فرق یہ ہے کہ شعبہ نے قتادہ سے بصیغۂ عن روایت کیا ہے جس میں انقطاع واتصال دونوں کا احتمال ہے اور حسین معلم نے صیغۂ تحدیث استعمال کیا ہے، اسی لئے حضرت مصنف رحمہ اللہ نے دونوں کو جمع نہیں کیا بلکہ الگ الگ ذکر فرمایا ہے، لیکن چونکہ شعبہ مدلس نہیں ہیں اس لئے ان کا عن قتادۃ ـ کہنا بھی ـ حدثنا قتادۃ ــــ کے

نے اعلان فرمایا

من کان له عند النبی صلی الله علیه وسلم دین او عدة فلیاتنی — نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی کا دین ہو یا آپ کا اس سے وعدہ ہو وہ میرے پاس آئے

(بخاری باب قصۃ عمان البحرین من کتاب المغازی)

چنانچہ اس اعلان کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے اور کہا کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین کا مال آنے پر مجھ سے اس قدر دینے کا وعدہ فرمایا تھا، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے وعدہ فرمالیا، بحرین سے مال آگیا تو حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس پہونچ گئے۔ اس وقت آپ نے کسی وجہ سے نہیں دیا، چند روز کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے پھر یاد دلایا تو وہی جواب ملا، پھر تیسری بار کہا اور جب بارگاہ خلافت سے وہی جواب ملا تو حضرت جابر نے کہا

قد اتیتك فلم تعطنی ثم اتیتك — میں آپکے پاس آیا مگر آپنے کچھ نہ دیا، پھر دوبارہ آیا
فلم تعطنی ثم اتیتك فلم تعطنی — پھر آپنے نہ دیا پھر سہ بارہ آیا پھر کچھ نہ دیا
فاما ان تعطینی واما ان تبخل عنی — پس یا تو آپ مجھے دیدیجئے، اور یا بخل
(بخاری ایضاً) — ہی کرلیجئے

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے یہ بخل کا لفظ برداشت نہ ہوسکا اور فرمایا

اقلت تبخل عنی وای داء ادوء من البخل قالها ثلاثا (بخاری ایضاً) — کیا تم یہ کہتے ہو کہ مجھ سے بخل کرے، اور کونسی بیماری بخل سے زیادہ مہلک ہے۔ یہ آپنے تین مرتبہ کہا

اور پھر لپ بھر کر درہم اٹھائے اور فرمایا ان کو گن لو چنانچہ وہ پانچسو تھے، اور کہا

خذ مثلها مرتین (بخاری ایضاً) — اسی جتنے اور دو مرتبہ لے لو

اسی صفت بخل کے علاج کے لئے حدیث شریف میں اطعام طعام کا ذکر کیا گیا ہے

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوگیا کہ حدیث شریف میں جوابات کا یہ اختلاف الفاظ سوالات کے اختلاف کا نتیجہ ہے، رہا ان روایات کا معاملہ جن میں افضلیت کے سلسلہ میں احبیت، اور احبیت کے سلسلہ میں افضلیت کے اعمال کا ذکر ہے تو اگر اس کو راوی کا سہو نہ کہیں تو ان اعمال کو ذو جہتین کہہ لیں گے

امام بخاری رحمۃ اللہ کا مقصد اس طرح حاصل ہوتا ہے کہ ہم احادیث کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہیں کہ ایمان میں افضلیت، احبیت، اور خیریت سب اعمال کے راستہ سے آتی ہے۔ اس لئے مرجیہ کا یہ کہنا کہ اعمال کا ایمان سے کوئی ربط نہیں، اور اعمال ایمان کی ترقی اور اس کے نقصان کے سلسلہ میں کبیر

پیغمبروں کے لئے خداوند قدوس نے سلطنت پسند نہیں فرمائی اور نہ انہیں سلطنت دی ہی گئی لیکن اگر کسی کو نوازا گیا ہے تو اس کی یہ شان ہے کہ دوسروں کے لئے اسکا تصور بھی انسانی طاقت سے ماوراء معلوم ہوتا ہے اسی طرح مقام محمود کا اصل مقصد اولین وآخرین کی اس مشکل کو حل کرنا ہے جس سے تمام پیغمبروں نے جواب دیدیا تھا، خداوند قدوس نے پہلے ہی سے طے کردیا ہے کہ یہ مقام محمود آپ کے لئے ہے لیکن شریک ثواب کرنے کے لئے ہمیں بھی دعا کا حکم دیا گیا ہے

غرض حدیث کا یہ منشا نہیں کہ اس میں خصوصیات کا بھی خیال نہ کیا جائیگا بلکہ مقصد یہ ہے کہ جس طرح امور خیر کی تمنا اپنے لئے کی جائیگی اسی طرح دوسروں کے لئے بھی یہی تمنا ہونی چاہیئے۔ ایک مطلب یہ بھی ہے کہ یہ ترک حسد سے کنایہ ہے، عموماً لوگوں میں خیر کے معاملہ میں حسد کی جاتی ہے، حاسد کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ محسود علیہ سے یہ چیز چھن جائے، کیونکہ انسان یہ دیکھنا پسند نہیں کرتا کہ اس کے ابناء جنس میں کوئی شخص اس سے بڑا ہوجائے حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا کہ مومن کا کام حسد نہیں بلکہ مومن یہ چاہتا ہے کہ خیر میں زائد سے زائد افراد شریک ہوجائیں، اور یہی چیز ایمان کے تقاضوں کے مناسب بھی ہے

بعض نے کہا ہے کہ اخ سے مراد مسلم ہے لیکن یہ درجہ ادنیٰ ہے ورنہ لفظ کے اندر گنجائش ہے کیونکہ وہ ذمی بھی ان مراعات کا مستحق ہے جس نے مساوات کا معاملہ کیا ہے ذمی کو نقصان پہونچانا خطرہ میں مبتلا کرنا یا دشمنوں کے حوالہ کردینا مسلمان کو نقصان پہونچانے کے مرادف ہے

اسی طرح پڑوسی بھی اس کے اندر آجاتا ہے بلکہ بعض روایات میں — ان یحب لجارہ[ؑ] — کے الفاظ آتے ہیں اور لفظ جار میں تعمیم ہے خواہ وہ مسلم ہو یا یہودی ومجوسی —

امام اعظم رحمہ اللہ کے پڑوس میں ایک مجوسی رہتا تھا گانے بجانے کا مشغلہ تھا جب امام اعظم رحمہ اللہ آخر شب میں تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو وہ گانے بجانے لگتا، ان اشعار میں ایک مصرعہ

ع ۔ اضاعونی وای فتی اضاعوا — انہوں نے مجھے گنوا دیا اور کیسے نوجوان کو انہوں نے گنوایا ہے

بھی تھا، امام رحمۃ اللہ نے کبھی اسکو منع نہیں فرمایا کسی موقعہ پر اس مجوسی کو حکومت نے گرفتار کرلیا امام رحمہ اللہ تشریف لے گئے اور اسے رہا کرا لائے اور فرمایا کہ اور لوگ ہوں گے تمہیں ضائع کرنے والے، ہم نے تو تمہیں ضائع نہیں ہونے دیا

یہاں بھی اور تمام احادیث کی طرح — لا یومن — کے یہی معنی ہیں کہ وہ شخص جس میں یہ اوصاف ہوں ان افراد سے بہت سے جوان اوصاف سے خالی ہیں، نیز یہ بھی کہ ایمان کے لئے صرف اس وصف کا پیدا ہوجانا کافی نہیں ہے بلکہ اور تمام شرائط ایمان کے ساتھ یہ وصف پایا جائیگا تو ایمان، ایمان بنتا ہے، امام بخاری

ؑ مسلم شریف "

مرادف ہے بلکہ شعبہ کا نام آنے کے بعد قتادہ کا عنعن بھی مقبول ہوجاتا ہے، کیونکہ قتادہ مدلس ہیں اس لئے ان کی معنعن روایت بغیر کسی توثیق کے قابل قبول نہیں ہوتی، اور شعبہ کا نام اس توثیق کے لئے کافی ہے

تشریح حدیث ارشاد ہے کہ جب تک مسلمان اپنے بھائیوں کے لئے ان چیزوں کا خواہشمند نہ ہو جو اپنے لئے چاہتا ہے اس وقت تک اس کا ایمان کمزور ہے، عام اس سے کہ وہ چیز دنیا سے متعلق ہو یا آخرت سے، مثلاً آپ اقتدار کے خواہاں ہیں تو حسب حال دوسروں کے لئے بھی اس کے خواہاں رہیں یا مثلاً آپ کو رزق حلال کی تلاش ہے یا آپ رزق حلال کھاتے ہیں تو آپ کی یہ تمنا ہونی چاہئے کہ دوسرے بھی اس سے محروم نہ رہیں

اب اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ بعض حضرات پیغمبر علیہم السلام اور دوسرے صالحین سے بعض خاص چیزوں کی دعا منقول ہے، قرآن کریم میں بعض صالحین کی دعا منقول ہے

واجعلنا للمتقین اماما ﴿پ ۱۹ ر ۴﴾ اور ہمکو متقیوں کا افسر بنا دے

اس آیت میں امامت کی دعا کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ امامت ایک خاص چیز ہے، اگر اس میں خصوص نہ رہے اور سب امام ہو جائیں تو ماموم کون رہے، قرآن کریم میں یہ دعا ان صالحین کی طرف سے نقل کی گئی ہے جن کی متعدد صفات ذکر کی گئی ہیں، پھر یہ کیسے درست ہے؟ اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے لئے وسیلہ اور مقام محمود کی دعا کیا کرو مجھے امید ہے کہ میں ہی اس کا مستحق ہونگا، بلکہ بعض پیغمبروں کی دعائیں تو دوسرے کی شرکت کا صراحت سے انکار ہے حضرت سلیمان علیہ السلام سے منقول ہے

رب ھب لی ملکاً لا ینبغی لاحد من بعدی ﴿مسند احمد ص ۲۹۸ ج ۲﴾ اے اللہ مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد کسی دوسرے کیلئے مناسب نہ ہو

اس میں صراحت ہے کہ مجھے اس شان کی حکومت دے کہ میرے بعد کسی کو وہ چیز حاصل نہ ہو سکے اسی دعا کے احترام میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس جن کو چھوڑ دیا تھا جس نے نماز کو خراب کرنا چاہا تھا اور آپنے اسکو پکڑ لیا، ارادہ بھی کیا کہ اسے ستون سے باندھ دیں تاکہ صبح کو مدینہ کے لڑکے مذاق کر سکیں لیکن پھر اس خیال سے چھوڑ دیا کہ لوگ کہیں گے سلیمان علیہ السلام کی دعا قبول نہیں ہوئی۔ عہ

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ حدیث کا منشا یہ نہیں ہے کہ ہر چیز میں سب کو شریک رکھنے کی تمنا کرے خواہ وہ چیز خصوصیات ہی میں سے کیوں نہ ہو، کیونکہ اگر ساری دنیا امام بن جائے تو ماموم کون رہے، سب ہی حاکم بن جائیں تو محکوم کون رہے، اس لئے ان چیزوں میں تو شرکت اور تعدد کی گنجائش ہی نہیں ہے، اور انبیاء کرام علیہم السلام کی دعاؤں میں کرسی اور دنیاوی اقتدار کی طلب نہیں ہے، کیونکہ ایسی حکومت جو حیوانات اور جنات سب پر یکساں ہو سلیمان علیہ السلام کا اعجاز تھا اور وہ اس اعجاز کو عالم کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے کہ اگرچہ

عہ بخاری باب الاسیر او الغریم ص ۲۶

باب سابق میں ——— من الایمان ان یحب لاخیہ ——— فرمایا ہے حالانکہ حدیث میں ——— لا یومن احدکم ——— کو حب رسول سے پہلے ذکر کیا گیا ہے، اس تقدیم کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ——— من الایمان ان یحب الرسول ——— کہا جائے، لیکن ایسے یا تو امام بخاری رحمہ اللہ کا تفنن کہا جائے یا پھر یہ کہ امام نے تادیباً آپکا اسم گرامی پہلے ذکر کیا اور پھر ——— من الایمان ——— کہا کیونکہ یہ تو بالکل ہی ظاہر ہے کہ ایمانیات کے سلسلہ میں آپکی محبت اصل الاصول ہے

ترجمہ کے ذیل میں امام بخاری رحمہ اللہ نے دو حدیثیں ذکر فرمائی ہیں اور دونوں میں والد کو ولد پر مقدم ذکر کیا گیا ہے اور بعض طرق میں ولد کو بھی مقدم ذکر کیا گیا ہے، دونوں کے لئے معقول وجہ ہوسکتی ہے، والد کو ولد پر اس لئے مقدم ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اصل ہونے کی بنا پر قابل تعظیم وتکریم ہے اور تعظیم کا تقاضا ہے کہ اسے ذکر میں مقدم کیا جائے، اور ولد کی تقدیم کی یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ معاملہ محبت وشفقت کا ہے اور محبت جس قدر والد کو ولد سے ہوتی ہے ولد کو والد سے نہیں ہوتی، اور یہاں مقصد بھی یہی ہے کہ پیغمبر علیہ السلام سے محبت کا تعلق تمام اجناس سے زائد ہونا چاہئے جو ولد کی تقدیم سے حاصل ہوتا ہے، والد کی تقدیم کی ایک نہایت اہم وجہ یہ ہے کہ ہم سے پیغمبر علیہ السلام کی نسبت والد ہی کی ہے، ترمذی شریف کی روایت ہے

انما انا لکم بمنزلۃ الوالد   میں تمہارے لئے باپ کے رتبہ میں ہوں

پھر جس طرح ولد مذکر اور مونث دونوں کو شامل ہے کیونکہ کسی کو اولاد ذکور سے زیادہ تعلق ہوتا ہے اور کسی کو اناث سے، اسی طرح والد کا لفظ بھی بطور فاعل ذی کذا مذکر ومونث دونوں کو شامل ہے کیونکہ اس کے معنی اس وقت ——— ذو ولد ——— ہوں گے جیسے ——— لابن و تامر ——— کے معنی ——— ذو لبن اور ذو تمر ——— کے ہیں، اس تعمیم کی بنا پر حاصل یہی نکلا کہ پیغمبر علیہ السلام کی محبت ان اعزا کی محبت سے زیادہ ہونی چاہئے جن کی محبت میں انسان اندھا ہوجاتا ہے اور جو انسان کے نزدیک پوری دنیا سے عزیز رہتے ہیں

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دونوں روایتوں میں والد اور ولد کی محبت کا ذکر آیا ہے اپنے نفس کا نہیں آیا حالانکہ انسان کو اپنے نفس سے زیادہ تعلق ہوتا ہے، لیکن دوسری روایت میں ——— والناس اجمعین کا اضافہ ہے جس میں انسان کی اپنی ذات اور نفس بھی شامل ہے

دوسری روایت میں دو سندیں ہیں، گویا امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ روایت دو استادوں سے لی ہے پہلی سند میں امام کے استاد یعقوب اور دوسری میں آدم ہیں، درمیان میں تحویل کی صورت اس لئے نہیں اختیار کی جاسکی کہ سندیں حضرت انس رضی اللہ عنہ پر ملتی ہیں، پھر عبدالعزیز بن صہیب عن انس اور قتادہ عن انس میں کیا فرق ہے کہ امام نے متن حدیث قتادہ سے نقل کیا اور عبدالعزیز سے نقل نہیں کیا، بات یہ ہے ——— کہ

عہ مسلم باب وجوب محبۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ عہ مسلم ایضاً ۱۲ عہ ابوداؤد ص۳

رحمہ اللہ کا مقصد بھی یہی ہے کہ مرجیہ نے اعمال کو ایمان سے بالکل بے تعلق بتلایا تھا حالانکہ احادیث کی روشنی میں یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اگر ان اعمال میں ذرا بھی کمی ہو جائے تو ایمان میں کمزوری آجاتی ہے

باب حُبُّ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْاِيْمَانِ **حدثنا** ابو الْيَمَانِ قَالَ ثَنَا شُعَيْبٌ قَالَ ثَنَا ابُو الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ ــــــ

حدثنا يَعْقُوْبُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ ثَنَا ابْنُ عُلَيَّةَ عَنْ عَبْدِ الْعَزِيْزِ بْنِ صُهَيْبٍ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ح **وحدثنا** آدَمُ بْنُ اَبِيْ اِيَاسٍ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۔

ترجمہ. **باب** رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ایمان میں داخل ہے ــــــ ابو الیمان نے حدیث بیان کی فرمایا کہ ہم سے شعیب نے حدیث بیان کی، فرمایا کہ ہم سے ابو الزناد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بروایت اعرج یہ بیان فرمایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے آباء و اجداد سے زیادہ محبوب ہو جاؤں

یعقوب بن ابراہیم نے حدیث بیان کی فرمایا کہ ہم سے ابن علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بروایت عبد العزیز بن صہیب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بیان کیا ح اور آدم بن ابی ایاس نے حدیث بیان کی فرمایا کہ ہم سے شعبہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بروایت قتادہ یہ بیان کیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک، اس کے آباء و اجداد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہو جاؤں

ترجمہ کا مفہوم پہلے باب میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ ایمان کا تقاضا ہے کہ انسان جس چیز کو اپنے لئے پسند کرتا ہے اسے دوسرے کیلئے بھی پسند کرے جب دوسرے بھائیوں کے ساتھ بھی معاملہ اس طرح رکھنے کا حکم ہے تو ظاہر ہے کہ حب رسول کا معاملہ تو نہایت ہی اہم ہے، گویا پہلا باب اس باب کے لئے دلیل کی حیثیت رکھتا ہے

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے ــــ من الایمان ان یحب الرسول ــــ نہیں فرمایا، جیسا کہ

ید سے مختلف ہے جب مخلوقات ہی آپس میں بے انتہا مختلف ہیں انسان وحیوانات میں فرق ہے، چرند اور پرند کی وضع میں فرق ہے تو خالق کو مخلوقات پر قیاس کرنا یقیناً درست نہیں، خداوند قدوس کے متعلق یہ کہنا بھی انتہائی حماقت ہے کہ اس کے ہاتھ سونے اور چاندی کے ہیں، روافض کا یہ کہنا بھی کفر ہے کہ وہ آدھا ٹھوس اور کھوکل ہے۔ اسی لئے سمع، بصر، اور دوسری وہ تمام چیزیں جنکو خداوند قدوس نے اپنی طرف منسوب کیا ہے متشابہات میں سے ہیں

غرض یہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پوری تاکید کے ساتھ بیان فرما رہے ہیں کہ تمہارا ایمان میری بڑی محبت پر موقوف ہے، دیکھنا یہ ہے کہ اس محبت سے کونسی محبت مراد ہے۔ اسمیں اکابر کے اقوال مختلف ہیں بعض بزرگوں کی تحقیق ہے کہ اس سے مراد محبت طبعی ہے کیونکہ حدیث میں والد اور ولد سے مقابلہ ڈالا گیا ہے جن کی محبت طبعی ہوتی ہے اس مقابلہ سے معلوم ہوا کہ پیغمبر علیہ السلام کی محبت بھی طبعی ہونی چاہیئے اور آیت کریمہ میں بھی مقابلہ پر انہیں چیزوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن کی طرف انسان کا میلان طبعی ہوتا ہے آیت کریمہ ملاحظہ ہو

قل ان کان آباؤکم وابناؤکم	آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بھائی
واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم	اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو
واموال اقترفتموها وتجارة	تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ
تخشون کسادها ومساکن	ہونیکا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے
ترضونها احب الیکم من الله ور	ہو تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی
رسوله وجهاد فی سبیله	راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم
فتربصوا ۸ پ ۱۰	منتظر رہو۔

ہاں آباء، ابناء، اخوان، ازواج، تجارت، اموال، وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے جن سے انسان کو طبعی تعلق ہوتا ہے اس لئے حدیث اور آیت شریفہ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں جس محبت کا مکلف بنایا گیا ہے وہ طبعی ہے اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے احوال بھی کچھ اسی قسم کے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ طبعی تعلق تھا،

غزوۂ خیبر سے واپسی پر پیغمبر علیہ السلام اور حضرت صفیہ جنکا عقد راستہ ہی میں ہوا تھا ایک اونٹنی پر سوار تھیں، ٹھوکر لگی اور آپ اونٹنی سے گر گئے اور حضرت صفیہ بھی حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے جو اونٹنی پر سوار تھے جب یہ دیکھا کہ پیغمبر علیہ السلام گر گئے ہیں تو بلا توقف اپنے آپ کو اونٹنی سے گرادیا یعنی نہ اونٹ بٹھاتے

بخاری شریف

عبد العزیز کے طریق سے جو متن منقول ہے اسکو ابو الیمان کی پیش کردہ پہلی حدیث کے ساتھ معنی تو شرکت ہے لیکن الفاظ بدلے ہوئے ہیں، ابو الیمان کی روایت میں تو — من والدہ وولدہ — ہے اور عبد العزیز کی روایت میں — من اھلہ ومالہ — کے الفاظ ہیں اور قتادہ کی روایت میں پورا پورا تطابق ہے بلکہ تطابق کے بعد — والناس اجمعین — کا اضافہ بھی ہے

تشریح حدیث | حدیث شریف میں ارشاد ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے دل میں والد اور ولد اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہو جاؤں ،

دراصل جب ہم اس بات پر نظر کرتے ہیں کہ والد اور ولد کی محبت طبعی اور غیر اختیاری ہے اور پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ جو تعلق ہوگا خواہ وہ آپکی سنت کی نصرت کا ہو یا آپکے احکام کی اطاعت کا ہو یا آپکی شریعت سے دوسروں کے حملوں کی مدافعت کا وہ سب اختیاری ہوگا ، اس لئے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آپکی اختیاری محبت والد اور ولد کی غیر اختیاری محبت پر کس طرح غالب آسکتی ہے

یہ ایک ایسا موقعہ تھا کہ جس پر سننے والے کو تردد ہو سکتا تھا اور بہت ممکن تھا کہ انکار کی نوبت آجائے اس لئے اہمیت جتلانے کے لئے قسم کھا کر بیان کرتے ہیں ، یا یوں کہہ لیجئے کہ معاملہ جس قدر اہم ہوتا ہے بیان کرنے والے کو اسی قدر بیان میں قوت پیدا کرنی پڑتی ہے ، کیونکہ اگر اہم معاملہ کو معمولی طور پر بیان کیا جائے تو اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے ، اسی اہمیت کے پیش نظر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بیان میں قسم کے ذریعہ زور پیدا فرما رہے ہیں کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے

آپ کا بغیر کسی تاکید کے بھی بیان فرما دینا سامعین کے لئے پوری پوری تسلی اور تسکین کا باعث ہے ، کیونکہ یہ کسی عام انسان کا کلام نہیں ہے جس کے بارے میں کچھ تردد کی گنجائش ہو ، لیکن جب تاکید وقسم بھی ہو تو وزن اور بھی بڑھ جائیگا ، قسم بھی اپنی جان کی کھا رہے ہیں یعنی تم جانتے ہو کہ میرا نفس کتنا پاکیزہ اور صاف ستھرا ہے ، اور کسقدر اوصاف حمیدہ کا حامل ہے ، کسقدر افعال جمیلہ کا محرک ہے ، میں اس ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ، قسم کے الفاظ میں — ید — کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ[1] نے فرمایا ہے کہ ید سے قوت مراد لینا خداوند قدوس کو معطل کر دینے کے مرادف ہے ، یہ تاویلات حضرات متاخرین نے مجبوری کے درجہ میں کی ہیں ، جب یہ دیکھا کہ فلاسفہ کے اصول کو ہاتھ میں لیکر فرق باطلہ نے اسلام کے شفاف اصولوں پر اعتراضات کئے ہیں تو یہ ضرورت ہوئی کہ مسائل کو اسی رنگ میں سمجھا دیا جائے گویا مقصد منہ بند کرنا تھا ورنہ بات اپنی جگہ صرف یہ ہے کہ خدا کے لئے ید ہے لیکن اس کی نوعیت مخلوقات کے

[1] عینی ۱۲

دوا سے طبعاً نفرت ہوتی ہے لیکن بروئے عقل وہ دوا کے استعمال پر مجبور ہے۔ ایک طرف باپ بیٹے کی محبت کا تقاضا ہے جس کی وجہ سے انسان بسا اوقات خلاف شرع کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور دوسری طرف شریعت کا فیصلہ ہے کہ اس میں تمہارا نقصان، تمہاری شریعت کا نقصان ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان طبعی رجحان کی طرف مائل ہوتا ہے یا عقل کے مانع آجانے سے رک جاتا ہے، اگر عقل کے روکنے سے باز آجاتا ہے تو مومن ہے ورنہ ایمان میں نقصان ہے

اور ایک حب ایمانی ہے یہ ان دونوں سے اوپر کی چیز ہے کہ اطاعت اور فرمانبرداری تا حد امکان عمل ہونی چاہیئے، اس میں نہ نفع کی تمنا ہے اور نہ نقصان کی پرواہ، حب عقلی میں نفع ونقصان پر نظر ہوتی ہے، حب ایمانی میں ایسا نہیں ہے، پھر جب یہ ایمان کا تقاضا ہے کہ نفع ونقصان کی پرواہ کئے بغیر فرامین پر عمل کیا جائے تو جسقدر اعمال میں ترقی ہوتی رہے گی اسی قدر ایمان میں ترقی ہوتی رہیگی، حتی کہ یہ حب ایمانی حب عشقی میں تبدیل ہو جائے گی، جیسا کہ عاشق کی نگاہ میں محبوب کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس مقام پر آکر انسان کی نظر میں بھی کچھ نہیں رہتا، اختیار محبوب کے ہاتھ میں ہے، جس چیز سے روک دیا گیا رک گئے اور جس چیز کا حکم دیدیا گیا عمل پیرا ہو گئے۔ کیونکہ اس مقام پر آکر انسان کو اپنا احساس وجود بھی نہیں رہتا، اس مقام پر پہنچکر محبوب اگر یہ بھی کہدے کہ تم دور ہو جاؤ تو اس کو بھی اختیار کر لیتا ہے۔ گو عشق کے ساتھ یہ دوری بہت مشکل معلوم ہوتی ہے، لیکن عشق کا ایک یہ بھی عالم ہے

اریدوصاله ویرید هجری فاترك ما ارید لما یرید

کیونکہ اس وقت اپنی خواہشیں فنا ہو چکی ہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بھی اس کی مثال موجود ہے آپ نے حضرت وحشی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میرے سامنے نہ پڑا کرو چنانچہ حضرت وحشی کبھی سامنے نہیں آئے، اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ محبت غیر اختیاری طبعی تو ہو نہیں سکتی، کیونکہ انسان غیر اختیاری شے کا مکلف نہیں ہوتا، اب وہ محبت عقلی ہوگی یا ایمانی، اس لئے محبت کا آغاز حب عقلی سے ہوتا ہے کیونکہ ایمان کا تقاضا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کی اطاعت میں نفع اور معصیت میں ضرر ہے، اور جب حب عقلی ترقی کرتی ہے، تو حب ایمانی بن جاتی ہے اور اس وقت نفع ونقصان پر نظر نہیں رہتی، بلکہ انسان اس مقام پر صرف حکم دیکھتا ہے اور جب یہ حب ایمانی ترقی کر کے حب عشقی کے درجہ میں پہونچ جاتی ہے تو محبوب کے علاوہ سب کچھ ختم ہو جاتا ہے، آیت شریفہ قل ان کان آباءکم وابناءکم واخوانکم الآیۃ ـــ سے حب طبعی معلوم ہوتی ہے اور واقعۃً اس کے یہ معنی ہو بھی سکتے ہیں، جیسا کہ یہ بعض اکابر کا فیصلہ ہے، لیکن یہ معنی معین نہیں ہیں بلکہ دوسرے معنی بھی ہو سکتے ہیں، آیت میں چند مالوفات کا ذکر کیا گیا ہے کہ تم ان کی طرف راغب ہو جانا، اس لئے ان معنی کی بھی

کا انتظار کیا اور نہ احتیاط کے ساتھ کودنے کی کوشش کی بلکہ پیغمبر علیہ السلام کو اس حال میں دیکھکر اضطراری طور پر اپنے آپ کو نیچے پھینک دیا، حاضر خدمت ہوئے اور پوچھا۔ حضور! کہیں چوٹ تو نہیں لگی، آپ نے فرمایا صفیہ کو سنبھالو، حضرت ابو طلحہ کا بیان ہے کہ میں منہ پر کپڑا ڈال کر آگے بڑھا اور قریب پہنچکر وہ نقاب حضرت صفیہ کے چہرے پر ڈال دیا اور سوار کرایا اس والہانہ انداز سے صحابہ کی محبت کی نوعیت معلوم کی جاسکتی ہے

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ احد کے موقعہ پر میرے والد حضرت عبد اللہ نے مجھے وصیت کی کہ تم مجھے نفس پیغمبر علیہ السلام کے علاوہ سب سے عزیز ہو اور میں سمجھ رہا ہوں کہ کل صبح سب سے پہلے میں شہید ہونگا، میرے اوپر قرض ہے میں وصیت کرتا ہوں اسکی ادائیگی کی فکر کرنا، یہاں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ تم مجھے سب سے زیادہ عزیز ہو — غیر نفس رسول اللہ —

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ حضور! آپکی محبت میرے دل میں والد اور ولد سے بہت زیادہ ہے مگر میں اپنے نفس کی محبت اور بھی زیادہ پا رہا ہوں، آپ نے فرمایا عمر ابھی کمی باقی ہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غور کیا اور کہا کہ اب آپکی محبت میرے دل میں اپنے سے بھی زیادہ ہے، یہ سن کر آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا — الآن یا عمر! عہ

حضرت عبد اللہ بن زید بن عبد ربہ باغ یا کھیت میں پانی دے رہے تھے کہ بیٹے نے پیغمبر علیہ السلام کے وصال کی اطلاع دی۔ فوراً آنکھیں بند فرمالیں اور بارگاہ رب العالمین میں عرض کیا کہ اے خدا میں نے جن آنکھوں سے پیغمبر علیہ السلام کا جمال دیکھا ہے اب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میں انہیں کسی دوسری چیز کے لئے استعمال کرنا نہیں چاہتا۔ مجھ سے میری بصارت لے لے۔ چنانچہ انکی بصارت جاتی رہی

حضرت اویس قرنی کے متعلق مشہور ہے کہ جب انہیں یہ اطلاع ہوئی کہ پیغمبر علیہ السلام کا دندان مبارک شہید ہوگیا ہے تو انہوں نے اپنے تمام دانت توڑ لئے کیونکہ معین دندان مبارک معلوم نہ ہوسکا تھا

ان تمام واقعات سے معلوم ہو رہا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا جو تعلق تھا وہ محبت طبعی کے درجہ میں تھا بلکہ حب طبعی سے بھی کوئی اور اونچا درجہ ہو تو یہی ہو سکتا ہے

لیکن بعض دوسرے حضرات کا فیصلہ اس کے خلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ محبت کے مختلف درجات ہیں، حب عقلی، حب طبعی، حب ایمانی (حب شرعی) پھر حب ایمانی میں ایک درجہ حب عشقی کا ہے، حب طبعی ظاہر ہے کہ قطعاً غیر اختیاری چیز ہے اور کسی شخص کو بھی غیر اختیاری شے کا مکلف نہیں بنایا جاسکتا، تکلیف ہمیشہ اختیاری امور پر دی جاتی ہے اس لئے حب طبعی مراد نہیں لی جاسکتی، ہاں حب عقلی کی گنجائش ہے، حب عقلی کا مفہوم یہ ہے کہ خواہ حکم طبعی طور پر گراں گذرے لیکن عقل کا تقاضا ہے کہ تمام چیزوں پر اسی کو ترجیح دی جائے، جیسا کہ مریض کو

عہ عینی جلد اول ص ۱۶۹ بخاری ص ... باب ... ورتیع من العزوہ

ہو، کوئی بات ایسی نہ ہو کہ اس سے جمال میں نقصان معلوم ہوتا ہو، اور پیغمبر علیہ السلام کو محبوبیت خداوندی کا درجہ حاصل ہے، اور چونکہ آپ کو محبوبیت کے لئے اس ذات نے منتخب کیا ہے جو خالق جمال اور محب جمال ہے اس لئے وہ تمام چیزیں جن سے جمال متعلق ہو سکتا ہے آپ کے اندر بدرجۂ کمال موجود ہونی چاہئیں

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے جمال کے سلسلہ میں بیان فرماتی ہیں کہ اندھیری رات میں اگر سوئی کے اندر ڈورا ڈالنے کی بھی ضرورت ہوتی تو سوئی کو آپ کے جسد اطہر سے قریب کیا اور ڈورا ڈال لیا یعنی آپ کے جمال سے تاریکی دور ہو جاتی تھی، اسی طرح فرماتی ہیں کہ اگر کوئی چیز گم ہو جاتی تھی اور اندھیرے کے باعث ہاتھ نہ آتی تھی تو پیغمبر علیہ السلام کے دست مبارک کی روشنی میں اسے ڈھونڈھ لیا جاتا تھا

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ چودھویں رات میں کبھی چہرے پر نظر ڈالتا ہوں اور کبھی چاند پر، اور قسم کھا کر بیان فرماتے ہیں کہ جو جمال پیغمبر علیہ السلام کے چہرۂ انور میں نظر آیا چاند میں نہ تھا، اپنے جمال کے سلسلہ میں خود آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

اخی یوسف اصبح وانا املح منه — میرے بھائی یوسف مجھ سے زیادہ صبیح ہیں اور میں ان سے زیادہ ملیح ہوں

صباحت بہت اچھی چیز ہے، اگر نظر پڑ جائے تو جم جاتی ہے لیکن اگر ملاحت نہ ہو تو حسن میں کچھ پھیکا پن معلوم ہوتا ہے محبوبیت کے لئے صباحت سے زیادہ ملاحت درکار ہے۔ اور ظاہر ہے کہ خوبصورت انسان سب کے نزدیک محبوب ہوتا ہے، یہ حسن پرستی صرف انسان ہی میں نہیں بلکہ اس وصف میں حیوانات بھی انسان کے سہیم و شریک ہیں، ایک پرند ہے تدرو، جسے چکور کہتے ہیں، چاند پر عاشق ہوتا ہے، ادھر چاند نکلا اور ادھر اس نے رقص شروع کیا، اور چونکہ چاند تک رسائی ممکن نہیں ہے اس لئے چاندنی میں لوٹتا رہتا ہے

اسی طرح بلبل پھول پر جان دیتی ہے، اور صرف حیوانات ہی نہیں بلکہ یہ حسن پرستی کا مادہ درختوں میں بھی پایا جاتا ہے، بعض درخت ایسے ہوتے ہیں کہ حسین آدمی کو لپٹ جاتے ہیں

اس حسن پرستی کے سلسلہ میں انسان کو تو نہ پوچھئے، حجۃ الوداع کا واقعہ ہے حضرت فضل بن عباس بڑے حسین تھے، حجۃ الوداع میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری پر ردیف ہیں[1]، قبیلۂ خثعم کی ایک عورت آئی اور باپ کے متعلق سوال کیا کہ وہ اس قدر ضعیف العمر ہیں کہ سواری پر نہیں بیٹھ سکتے، ان پر حج فرض ہو چکا ہے کیا میں ان کی طرف سے حج ادا کرادوں یا کردوں

مسئلہ اپنی جگہ آئیگا، یہاں تو بتلانا صرف یہ ہے کہ ادھر فضل بن عباس ہیں اور ادھر قبیلۂ خثعم کی وہ حسین عورت، دونوں کی نظر ایک دوسرے پر جم گئی، اور یہ صرف حسن کی کشش کا نتیجہ ہے جو قطعاً غیر

[1] بخاری ص ۲۰۹ ج ۱ باب الرکوب والارتداف

گنجائش ہے اگر آیت کی تفسیر اس طرح کی جائے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ حب رسول کے سلسلہ میں مومن سے حب طبعی سے بھی کوئی اونچا درجہ مطلوب ہے، جس رسول پر سب کچھ قربان کیا ہے اس کا تقاضا ہے کہ جب تک ہماری رگوں میں خون دوڑ رہا ہے اس پر آنچ نہ آئے، تلوار پڑے تو ہم پر پڑے، تیر آئے تو نشانہ ہم بنیں، جبکہ باپ کی محبت بھی طبعی ہوتی ہے لیکن جب جان پر بن آتی ہے تو بسا اوقات انسان جاں سپاری میں کوتاہی کر جاتا ہے، حضرت جابر، حضرت طلحہ، حضرت ابودجانہ اور آپ کی آڑ میں شہید ہو جانے والے دوسرے انصار کا عمل یہی بتلا رہا ہے کہ ان کی حب، حب عشقی کے درجہ میں تھی جس کے مقابل حب ایمانی بھی ہیچ ہے

مومنین میں رسول کے ساتھ محبت کے مختلف درجات ہوتے ہیں، کسی کی محبت حب عقلی کے درجہ کی ہوتی ہے اور کسی کی حب ایمانی اور عشقی کے مرتبہ کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مرتبہ کو بڑھانا تھا اس لئے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کے پیش کردہ خطرہ اور خشیہ کو صاف کردیا

درجات کا اختلاف اس طرح معلوم کیا جا سکتا ہے کہ نابینا کو ترک جماعت کی اجازت ہے حضرت عتبان رضی اللہ عنہ کو اجازت عنایت فرمادی ہے اس لئے کہ وہ ضعیف البصر تھے اور جب حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نے اجازت طلب کی تو فرمایا، کیا اذان کی آواز آتی ہے؟ عرض کیا ہاں آتی ہے، آپ نے فرمایا، پھر نہ آنے کی کیا بات ہے، حضرت عبداللہ کا مقام یہ ہے کہ جب آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ فرماتے

مرحبا بمن عاتبنی ربی — مرحبا، اس ذات کے لئے جس کے بارے میں میرے رب نے مجھ پر عتاب کیا

اس ارشاد میں ــــ عبس وتولیٰ ان جاءہ الاعمیٰ ــــ کی طرف اشارہ ہے

بہرکیف محبت طبعی ہو یا ایمانی ــــ دیکھنا یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کی محبت سب سے زیادہ کیوں ہونی چاہیئے۔ محبت کے معنی ہیں میلان نفس۔ اور میلان ہمیشہ پسندیدہ چیز کی جانب ہوا کرتا ہے، ظاہر ہے کہ عالم اسباب میں میلان اور جھکاؤ کے چند ہی اسباب ہو سکتے ہیں، پہلے ان اسباب محبت کو دیکھا جائے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ وہ اسباب آپ کے اندر کامل ہیں یا دوسروں میں،

اگر وہ اسباب و اوصاف آپ کے اندر کامل و اکمل ہوں تو قاعدہ کی رو سے آپ کی محبت بھی سب سے زائد ہونی چاہیئے، وہ اسباب محبت چار ہیں

جمال، کمال، قرابت، احسان،

جمال یعنی خوبصورتی، یہ ظاہری بھی ہوتی ہے اور باطنی بھی، اس باطنی خوبصورتی ہی کی دوسری تعبیر کمال ہے یہ چاروں اسباب جالب محبت ہیں، ظاہری خوبصورتی یہ ہے کہ انسان خوبرو ہو اعضاء میں تناسب اور اعتدال

لتنصرنه   سپ ۳ ر ۱۷   کی طرفداری بھی کرنا

اور کمالات میں اصل کمال علمی ہے، اور کمال علمی بھی اسی کمال علمی کا نتیجہ ہے اور پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد ہے

اوتیت علم الاولین و الاخرین

یعنی جتنے علوم سابق میں تھے وہ سب میرے پاس ہیں، اور جو میرے مخصوص علوم ہیں وہ کسی کے پاس نہیں، اسی کمال علمی کے باعث حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت دی گئی تھی، اس کمال علمی کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا تھا اور آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ____ الیوم اکملت لکم دینکم ____ کے اعلان کے ساتھ اسکا اتمام کر دیا گیا۔

پھر اگر کمال میں تسخیر کی قوت ہے اور باکمال انسان کے لئے دنیا مسخر ہو جاتی ہے تو پیغمبر علیہ السلام کا کمال بہت بلند ہے، پیغمبر علیہ السلام کے کمالات کو اگر دنیا کے تمام کمالات کے ساتھ وزن کیا جائے تو دنیا کے یہ تمام کمالات اس قدر ہیچ نظر آئیں کہ بیان کے لئے بھی کوئی نسبت نہ مل سکے

اسی طرح محبت کے تیسرے سبب یعنی قرابت کو لے لیجئے، پیغمبر علیہ السلام اس اعتبار سے بھی بہت زیادہ لائق تعظیم و محبت ہیں۔ ارشاد ربانی ہے

النبی اولی بالمومنین من انفسھم   نبی مومنین کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی

سپ ۲۱ ر ۱۷   زیادہ تعلق رکھتے ہیں

اس سے زائد اور کیا قرب ہوگا کہ آپ روحانی باپ ہیں۔ ارشاد ہے

وازواجه امھاتھم   سپ ۲۱ ر ۱۷   اور آپ کی بیبیاں ان کی مائیں ہیں

جب ازواج مطہرات امہات ہیں تو آپ باپ ہوں گے، شاذ قراءت میں ____ وھو ابوھم ____ بھی موجود ہے، جسمانی باپ تخلیق کا واسطہ ہوتا ہے، لیکن کمالات اور خوبیوں کے پیدا کرنے میں جسمانی باپ کا کوئی دخل نہیں ہوتا یہ آپ ہی کی تعلیمات کا ثمرہ ہیں جو بالواسطہ حاصل ہوئی ہیں۔ اس لئے روحانیت کے سلسلہ میں ابوت کا مقام صرف آپکو حاصل ہے،

اور روحانی نسبت بھی مختلف طرح کی ہوتی ہے، استاد کی، شیخ طریقت اور ہادی کی، ان سب نسبتوں میں روحانی ابوت موجود ہے، ایک استاد کا بھی احترام اسی لئے ہے، کہ وہ روحانی باپ ہے علوم اسی کے واسطہ سے ملتے ہیں، باپ اگر جاہل ہو تو اس کا یہ مقام نہیں ہے پھر استاد کے بعد شیخ طریقت کا درجہ ہے جس کی توجہات نے روحانیت بخشی، اور ان علوم میں جان پڑ گئی جن کا استاد نے افاضہ کیا تھا، اس لئے شیخ کا درجہ استاد سے بھی بڑھا ہوا ہے، جب جسمانی باپ کو بیٹے کے منقولہ اموال میں تصرف کا حق ہے

اختیاری چیز، آپ نے حضرت فضل کا منہ پھیر دیا، گو آپکی موجودگی میں کوئی خطرہ نہ تھا، لیکن صرف اس لئے ایسا کیا کہ حسن میں کشش ہوتی ہے، مبادا کوئی اثر ہو جائیگا، قرآن کریم میں بھی حسن کے اعجاب اور کشش کے لئے شہادت موجود ہے، ارشاد ہے

لا یحل لك النساء من بعد ولا	ان کے علاوہ اور عورتیں آپ کے لئے حلال نہیں اور
ان تبدل بهن من ازواج ولو	نہ یہ درست ہے کہ آپ ان بی بیوں کی جگہ دوسری
اعجبك حسنهن الا ما ملكت	بدلیں اگرچہ آپکو ان کا حسن اچھا معلوم ہو مگر جو آپ
يمينك ۲۲پ ۳	کی مملوکہ ہو

آیت کریمہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہے کہ خواہ آپکو ان کی بات پسند آجائے، معلوم ہوا کہ حسن میں غیر معمولی کشش ہوتی ہے، پھر اگر حسن میں کشش اور اس کا تقاضا محبت ہے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں سب سے زیادہ کشش ہونی چاہیئے، کیونکہ آپ کی ذات گرامی میں جمال کے سلسلہ کی ہر چیز بدرجۂ اتم موجود ہے۔

دوسرا سبب محبت، کمال یعنی جمال باطنی ہے، ظاہر ہے کہ جب کسی شخص میں اعلیٰ درجہ کے اخلاق جمع ہوتے ہیں تو وہ اپنے اخلاق سے دوسروں کو مسخر کرلیتا ہے بڑے بڑے سرکش اس کی خوش اخلاقی سے پانی ہو جاتے ہیں، پیغمبر علیہ السلام کو حسن ظاہری کے ساتھ حسن باطنی بھی کامل طور پر عطا کیا گیا تھا، اور جس شخص میں کمال ہوتا ہے، وہ سب کے نزدیک محبوب ہوتا ہے

ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ صورت و شکل کی خامی کے باوجود صرف کمال کی وجہ سے انہیں محبوب سمجھا گیا، بلکہ بسا اوقات انہیں سلاطین پر بھی ترجیح دی گئی۔ آپ کی ذات اقدس میں تمام انسانی کمالات بدرجۂ اتم موجود تھے، آپ نے فرمایا ہے

انا سيد ولد آدم ولا فخر [1]	میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور کوئی فخر نہیں

آپ کی شان سیادت سب سے نمایاں ہے اسی لئے انبیاء کرام علیہم السلام سے عہد لیا گیا تھا کہ جب آپ ظاہر ہوں تو ان کا اتباع کرنا، ارشاد ہے

اذ اخذ الله ميثاق النبيين	اور جب عہد لیا اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے کہ جو کچھ میں
لما آتيتكم من كتاب وحكمة	تمکو کتاب اور علم دوں پھر تمہارے پاس کوئی
ثم جاء كم رسول مصدق لما	پیغمبر آوے جو مصداق ہو اس کا جو تمہارے
معكم لتؤمنن به و	پاس ہے تو تم اس رسول پر اعتقاد بھی لانا اور اس

[1] مسلم باب تفضیلۃ النبی علی جمیع الخلائق ۱۲

کہ اگرچہ ہمیں یہ معلوم تھا کہ پیغمبر آنے والے ہیں لیکن اسکا گمان بھی نہ تھا کہ وہ تم میں آئیں گے

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے جب رستم فارس کے سامنے پچاس ہزار کی جمعیت میں بیان دیا ہے وہ بھی اس سلسلہ میں دیکھنے کی چیز ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم سب سے زیادہ ذلیل تھے، ہم مردار کھاتے تھے غربت کی وجہ سے مردہ جانور اور درختوں کی چھالوں کو کھاجاتے تھے، ہم نے پتھروں کو معبود بنالیا تھا لیکن اللہ نے ہمارے اندر اپنا پیغمبر پیدا کیا جس کے حسب، نسب، اور اخلاق و کردار سے ہم پورے طور پر باخبر تھے، ہم نے پہلے اسے پرکھا اور پھر اس پر ایمان لے آئے، اس نے ہمیں یہ بتلایا کہ اگر ہم اس کے کہنے پر عمل کریں گے تو ہمیں دنیا اور آخرت کی سرداری حاصل ہوگی

اور ہوا بھی ایسا ہی، دنیا اور آخرت دونوں بنالیں، دنیا کی تمام سلطنتوں کو باجگذار بنالیا، ایک غیر مہذب قوم کو دنیا کا مودب اور معلم بنادیا، یہ تھی دنیوی حکومت کی شان، رہا اخروی معاملہ تو خداوند قدوس کا قرب سب سے بڑی نعمت ہے، جو اس امت کو حاصل ہے

مرسے پہلے یہ امت پلصراط سے گذرے گی، سب سے پہلے داخل جنت ہوگی اور جنت کی ایک سو بیس صفوں میں اَسّی صفیں اسی امت کی ہوں گی

یہ ایسی خصوصیات ہیں کہ جن میں کوئی امت شریک نہیں ہے، پھر اگر احسان میں کشش ہے اور ——— الانسان عبید الاحسان ——— صحیح ہے تو یقیناً پیغمبر علیہ السلام کی ذات میں سب سے زیادہ کشش موجود ہے اور آپ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ محبت کے لائق ہیں

اس توضیح کی روشنی میں یہ بات صاف ہوگئی کہ تعلق اور محبت کے لئے اس عالم آب و گل میں جس قدر بھی وجہیں ہوسکتی ہیں وہ سب آپ کی ذات والاصفات میں بدرجۂ کمال موجود ہیں، اس لئے آپ کے ساتھ محبت کا وہ علاقہ ہونا چاہیئے جو کسی اور انسان یا مخلوق کے ساتھ نہ ہو

بَابُ حَلَاوَةِ الْإِيْمَانِ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنّٰى قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ الثَّقَفِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا اَيُّوْبُ عَنْ اَبِيْ قِلَابَةَ عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ۔ اَنْ يَكُوْنَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَاَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ اِلَّا لِلّٰهِ وَاَنْ يَكْرَهَ اَنْ يَعُوْدَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ

ترجمہ۔ باب ایمان کی چاشنی کے بیان میں ——— محمد بن مثنی نے حدیث بیان کی

بلکہ وہ بیٹے کے انکار کے علی الرغم بھی تصرف کر سکتا ہے، جب جسمانی باپ کے یہ حقوق ہیں تو وہ ذات گرامی جس نے انسانیت سے ہمکنار کیا، روحانیت کی تعلیم دی، یقیناً ان حقوق کی بہت زیادہ مستحق ہے

چوتھا سبب محبت احسان ہے، انسان اپنے محسن کا فرماں بردار ہوتا ہے

الانسان عبید الاحسان — انسان احسان کا بندہ ہے

مشہور اور مسلم مقولہ ہے، عمرۂ حدیبیہ کے موقعہ پر جب صلح کی گفتگو ہو رہی تھی، مغیرہ بن شعبہ تلوار سونتے کھڑے تھے، گفتگو کرنے والا ادھر ادھر نظر ڈال کر کہتا ہے کہ یہ لوگ جو پیغمبر کے ارد گرد جمع ہو گئے ہیں ان کے بھی خواہ نہیں، ہاں کچھ اغراض وابستہ ہیں، ذرا مصیبت آئی اور یہ بھاگے

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ سن کر جلال آگیا اور بہت گرم اور سخت الفاظ استعمال کئے وہ شخص پوچھتا ہے یہ کون ہیں، کہا جاتا ہے، ابوبکر ہیں، جواب میں کہتا ہے کہ ابوبکر آپ کے مجھ پر احسانات ہیں ورنہ میں جواب دیتا یعنی صرف احسان کی وجہ سے زبان روک لی[1]، اور صرف انسان ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ حیوانات بھی احسانات کی وجہ سے جھکنے لگتے ہیں

اب دیکھنا یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کے کیا احسانات ہیں ظاہر ہے کہ تمام مخلوقات پر آپکا سب سے پہلا اور سب سے عظیم احسان یہ ہے کہ سب کا وجود آپ ہی کے وجود کا فیض ہے اور تمام احسانات تو بعد کے ہیں سب سے پہلی چیز تو وجود ہے جو آپ کی وساطت سے ملا ہے، باقی تمام انعامات بھی آپکی وساطت سے ملتے ہیں

انما انا قاسم واللہ یعطی[2] — میں تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے

یعنی تمام انعامات کی تقسیم میرے واسطہ سے ہوتی ہے حتیٰ کہ نبوت کی تقسیم بھی آپ ہی کی وساطت سے ہوئی، حدیث شریف میں ارشاد ہے

انی عبد اللہ لخاتم النبیین و — میں عبد اللہ خاتم النبیین ہوں حالانکہ آدم ابھی

ان آدم لمنجدل فی طینتہ (مسند احمد صفحہ ۱۲۷ ج ۴) — اپنی مٹی ہی میں تھے

پھر احسانات کی کوئی انتہا نہیں ہے، کیونکہ آپ نے ہدایت امت کے سلسلہ میں سخت جانکاہیوں کا سامنا کیا جس وقت آپ مبعوث ہوئے اس وقت کی عمومی حالت نہایت ابتر تھی، آیت کریمہ ملاحظہ ہو

کنتم علی شفا حفرۃ من النار — اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے سو اس

فانقذکم منہا — سے اللہ نے تمہاری جان بچائی

ایک جگہ ارشاد ہے کہ میری اور تمہاری مثال ایسی ہے کہ تم جہنم کے کنارے پر ہو اور میں تمہیں بچانے کی فکر میں ہوں آخذ بحجزکم کے الفاظ آتے ہیں، یہ لفظ بتا رہا ہے کہ قربانیاں دیکر بچایا ہے، اسی لئے تو ہرقل نے کہا تھا

[1] تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم صفحہ ۱۲۶۳ [2] بخاری جلد ثانی

ظاہر ہے کہ مٹھاس کسی کو کم معلوم ہوتا ہے کسی کو زیادہ، صفراوی مزاج والے کو مٹھاس کا احساس کم ہوتا ہے بلکہ اسے میٹھی چیز بھی کڑوی معلوم ہوتی ہے، اسی طرح اگر کسی کو ایمان میں حلاوت کا احساس نہیں ہوتا تو اس کا یہ مطلب ہے کہ معاصی کا صفرا اس کے مزاج پر غالب آچکا ہے

بس اسی لذت کی کمی، زیادتی سے امام بخاری رحمۃ اللہ نے ایمان کی کمی زیادتی اور ایمان پر اعمال کے اثر انداز ہونے کے سلسلہ میں استدلال کیا ہے جس سے مرجیہ کی کھلی تردید ہو رہی ہے

تشریح حدیث ارشاد ہے کہ جس شخص میں تین خصلتیں ہوں گی وہ حلاوت ایمان پا لیگا بعض اکابر سے سنا ہے کہ میٹھے کی طرف رغبت دلبستگی ایمان کی دلیل ہے، بڑے بوڑھوں کا یہ معمول رہا ہے کہ کھانے کے بعد گڑ کی ڈلی استعمال کرتے تھے۔ یہ گڑ ہاضم بھی ہے اور جسم میں حرارت بھی پیدا کرتا ہے حکیم اجمل خاں مرحوم سے کسی نے پوچھا کہ جماع کے بعد کمزوری محسوس کرتا ہوں حکیم صاحب نے اسے گڑ کی ڈلی بتلادی اسی وجہ سے عرب میں کھجور کو پسند کیا گیا ہے، احادیث میں آتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرمایا کہ ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں گرتے اور جو مسلم سے زیادہ مشابہ ہے، کیا تم میں سے کوئی شخص بتا سکتا ہے؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرات صحابہ کا ذہن جنگل کے درختوں کی طرف گیا اور میرے ذہن میں آگیا تھا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ آپ ہی ارشاد فرمائیں، پھر خود ہی آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ کھجور ہے [۱]

حدیث شریف میں تین چیزیں ارشاد فرمائی ہیں۔ ان تینوں میں پہلا نمبر یہ ہے کہ اللہ اور اسکا رسول تمام ہی چیزوں میں سب سے زیادہ محبوب ہوں، یعنی اللہ اور رسول اللہ کی اتنی محبت ہو کہ عالم میں کسی اور کی اتنی نہ ہو، اللہ کی محبت تو اس لئے کہ وہ منعم حقیقی ہے اور رسول کی محبت اس لئے کہ وہ محسن حقیقی ہیں، انعامات کی تقسیم کے لئے واسطہ ہیں، جب خدا اور رسول کی محبت کا یہ درجہ حاصل ہو گیا تو اب دوسرا درجہ یہ ہے کہ مخلوقات میں جس سے بھی تعلق ہو لوجہ اللہ ہو اور چونکہ محبوب کی پسند اپنی پسند ہوتی ہے اس لئے وہ تمام چیزیں جنہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا ہے اس کے نزدیک محبوب ہونی چاہئیں اور جب اس درجہ پر پہونچ گیا تو ان چیزوں سے انتہائی نفرت ہونی چاہیئے جن سے پیغمبر علیہ السلام نے منع فرمایا ہے مثلاً پیغمبر علیہ السلام نے کفر سے نکالکر اسلام کی راہ دکھائی ہے تو اب کفر سے اس درجہ نفرت ہونی چاہیئے جیسے دیدۂ و دانستہ آگ میں گرنے سے ہوتی ہے جب یہ تینوں چیزیں حاصل ہو جائیں گی تو حلاوت ایمان حاصل ہو جائے گی

یوں بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ انسان کے تعلقات کی دو قسمیں ہیں، ایک تعلق مع اللہ اور دوسرے تعلق مع الخلق مومن کامل وہ ہے جو ان تمام تعلقات کا حق ادا کرے جب یہ دونوں وصف کامل ہو جائیں گے ایمان کامل ہو جائیگا،

[۱] بخاری باب من رفع صوتہ بالعلم صلا۔

فرمایا کہ ہم سے عبد الوہاب ثقفی نے حدیث بیان کی انہوں نے فرمایا کہ ہم سے ایوب نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بروایت ابو قلابہ یہ بیان کیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تین خصلتیں جس میں ہوں گی وہ ایمان کی چاشنی پالیگا، ایک تو یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک باقی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں، اور جس شخص سے بھی محبت رکھے محض اللہ کے لئے رکھے، اور دوبارہ کفر اختیار کرنے سے اس طرح بیزار ہو جیسے آگ میں گرائے جانے سے بیزاری ہوتی ہے

مقصد ترجمہ یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ مرجیہ کے عقیدہ پر ایک ضرب کاری لگانا چاہتے ہیں کہ تم نے اعمال کو عام اس سے کہ وہ فرائض ہوں یا نوافل ایمان سے بالکل بے تعلق بتایا ہے حالانکہ احادیث شریفہ یہ بتلارہی ہیں، کہ ایمان میں حلاوت اور اعمال مطلوب ہیں اور جس شخص میں یہ تین چیزیں پائی جائیں گی وہ حلاوت اور شیرینی پالیگا، اور ان امور میں جسقدر کمی آتی جائیگی اسی قدر مراتب میں کمی ہوجائے گی

سابق میں امام نے یہ کہا تھا کہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے اور دیگر امور وہ ہیں کہ جنکا ایمان سے تعلق ہے، جستہ جستہ تفصیل بھی پیش فرماتے آرہے ہیں کہ فلاں عمل اسلام سے متعلق ہے اور فلاں عمل ایمان میں داخل ہے اور جب یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں تو ہر ایک کے متعلقات دوسرے کے متعلقات ہیں، تفصیل کے اندر امام نے یہ بتلایا کہ اسلام میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی مسلمان دوسرے کو اپنے ہاتھ سے نقصان نہ پہونچے اس سلسلہ میں اطعام طعام اور اقراء سلام کا ذکر کیا، اس کے بعد بتلایا کہ انسان کے اندر خیر اندیشی کا جذبہ جب ہی پیدا ہوسکتا ہے کہ انسان اپنے بھائیوں کو وہی درجہ دے جو اپنے آپ کو دیتا ہے اور یہ تمام باتیں اسی شخص میں پائی جاسکتی ہیں جسے پیغمبر علیہ السلام سے انتہائی محبت ہوگی کیونکہ یہ پیغمبر کی تعلیم ہے اور ان کو وہی اپنا سکتا ہے جسے آپ کی ذات اقدس سب سے زیادہ عزیز ہو اور جب کوئی ترقی کرکے اس درجہ پر پہونچ جائیگا تو اس کے ایمان میں مٹھاس اور لذت پیدا ہوجائیگی، وہ خداوند قدوس کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے بےچین رہیگا۔ اور جب طاعات میں لذت محسوس ہونے لگے گی تو معاصی سے نفرت ہوجائے گی گویا معاصی سے نفرت اس ایمان کی شیرینی کا نتیجہ ہے،

ایمان کے لئے شیرینی اور حلاوت کا لفظ استعمال فرماکر گویا ایمان کو شہد سے تشبیہ دے رہے ہیں، یعنی جیساکہ شہد میں مٹھاس ہوتا ہے اور وہ عموماً پسند کیا جاتا ہے جو خود آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پسند تھا، اس کے کھانے میں بھی لطف آتا ہے، اور وہ اندرونی امراض کا بھی علاج ہوجاتا ہے

فیہ شفاء للناس ـــ نحل پ ۱۵ ـــ اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے

فرمایا گیا ہے، اسی طرح ایمان میں لذت بھی ہے اور شفاء بھی، اور جب ایمان میں حلاوت ثابت ہوگئی تو

ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب بیٹھتے تھے تو آپس میں اس کا تذکرہ کرتے تھے، سب اپنے اعمال کے بارے میں اس سے خائف رہتے تھے کہ کہیں اندرون اعمال میں نفاق نہ ہو، اسی لئے تضرع کے ساتھ خداوندقدوس کی بارگاہ میں دعا کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے اپنے بارے میں نفاق کا اندیشہ ہے حضرت حذیفہ سے پوچھتے ہیں کہ میرا نام تو منافقین میں نہیں ہے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو منافقین کے نام بتلادئے گئے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جلالت شان سے کون انکار کرسکتا ہے لیکن اعمال کے باطن سے خائف ہیں

حاصل یہ نکلا کہ ایمان خوف و رجاء کے درمیان کا نام ہے اور جس شخص کو یہ مرتبہ نصیب ہوگا وہی حلاوت ایمان حاصل کرسکیگا، اس تشریح سے یہ ثابت ہوگیا کہ حدیث شریف میں ایسے اصول بتلائے گئے ہیں کہ جن کے اختیار کرنے کے بعد انسان کو طاعات میں لذت حاصل ہونے لگتی ہے اور معاصی سے نفرت بڑھتی ہے اس لئے مرجیہ کا اعمال کو ایمان سے یکسر بے تعلق کہنا بالکل غلط ہے

یہاں ایک اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں — ان یکون اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما — فرمایا گیا ہے جس میں ضمیر — ھما — میں اللہ اور رسول دونوں کو جمع کردیا گیا ہے اور خطیب نے پیغمبر علیہ السلام کی موجودگی میں جو خطبہ دیا تھا اس میں بھی — من یعصیھما — کے اندر اللہ اور رسول دونوں کو جمع کردیا تھا جس پر پیغمبر علیہ السلام نے

بئس الخطیب انت (عینی جلد ۱ ص ۱۷۵) تمہیں خطبہ دینا نہیں آتا

کے الفاظ کے ساتھ تنبیہ فرمائی تھی، اشکال یہ ہوتا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے جس جمع سے تاکید کے ساتھ منع فرمایا تھا اسی طرح حدیث شریف میں منع فرمایا ہے، آخر وجہ فرق کیا ہے

اہل علم نے اس اشکال کے مختلف جوابات دئے ہیں، ایک تو یہ کہ ہر چیز اپنے موقعہ کے اعتبار سے حسین یا قبیح کہلاتی ہے، ایک موقعہ تعلیم کا ہے اس موقعہ پر معلم کا کمال یہ ہے کہ اپنا مقصد متعلم کے سامنے جامع الفاظ میں پیش کردے تاکہ متعلم کو سمجھنے اور اس کے بعد محفوظ رکھنے میں آسانی ہو — خیر الکلام ما قل ودل — اور دوسرا معاملہ خطبہ کا ہے، خطبہ میں تفصیل وتطویل مطلوب ہوتی ہے، خطیب نے خطبہ کے موقعہ پر جمع کردیا تھا، جس کی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منع فرمایا

بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ حدیث شریف میں محبت کے اندر جمع کیا گیا ہے جو بالکل درست ہے کیونکہ کسی ایک کو چھوڑ کر دوسرے کی محبت نجات کا سبب نہیں بن سکتی بلکہ دونوں کی محبت جمع ہوگی تو کام چل سکیگا کیونکہ ایمان کا مدار دونوں کی محبت پر ہے اور خطیب نے معصیت کے معاملہ میں دونوں کو جمع کردیا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ مجموعۂ عصیانین نقصان کا باعث ہے، کسی ایک کی معصیت میں نقصان نہیں حالانکہ یہ واقعہ کے خلاف

خداوند قدوس سے تعلقات کے لئے فرمایا

ان یکون اللہ ورسولہ احب — یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک ان

الیہ مما سواھما — کے ماسوا سے محبوب ہوں

یعنی تمام مخلوقات سے زیادہ ان کی محبت ہو اور مخلوقات سے تعلقات کے لئے فرمایا

ان یحب المرء لا یحبہ الا للہ — یہ کہ محض اللہ کے لئے اس سے محبت ہو

یعنی محض اللہ کے لئے تعلق ہونا چاہیئے اور جب تعلقات میں للہیت آجائے گی تو دوسرے لوگوں کو ضرر رسانی کے جذبات یکسر ختم ہوجائیں گے۔ اللہ کے لئے تعلقات کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ انسان دوستی میں دوسرے انسان کی تمام باتیں برداشت کرے بلکہ اگر وہ کج رفتار ہے تو اسے سختی سے روک دے یہی خیر اندیشی کی بات ہے لو جو شخص مخلوق الٰہی سے خیر اندیشی کا تعلق رکھے گا وہ قرب خداوندی کا مستحق ہوگا۔ ان چیزوں کے پیدا ہونے کے بعد اسے رحمت خداوندی سے توقع ہونی چاہیئے کیونکہ معاملہ خداوند سے بھی اچھا ہے اور مخلوق خدا سے بھی۔ اور اسی پر مراتب قرب میں افزائش کا مدار ہے

پھر ایمانیات سے اس قدر گہرے تعلق کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی ضد سے بھی انتہائی تنفر ہونا چاہیئے، چنانچہ اسے تیسرے نمبر پر لا رہے ہیں، کہ اسے کفر اس قدر مبغوض ہوجائے کہ آگ میں گرنا اس کے نزدیک زیادہ سہل ہوجائے ایمان سے جس قدر لگاؤ اور تعلق ہوگا کفر سے اسی قدر نفرت اور اسکا تصور اسی قدر پریشان کن ہوگا، معاملہ بین الخوف والرجاء ہے، خدا کی ذات سے مایوسی بھی شیوۂ کفر ہے، ارشاد ہے

لا تیأسوا من روح اللہ انہ لا — اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو بیشک اللہ کی

یایئس من روح اللہ الا القوم — رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں ——— جو

الکافرون — ۱۳ پ ۱ — کافر ہیں

اسی طرح اعمال صالحہ پر غرہ بھی خسران کی دلیل ہے ارشاد ہے

فلا یامن مکر اللہ الا القوم — سو خدا کی پکڑ سے بجز ان کے کوئی بیفکر نہیں

الخاسرون — ۹ پ ۳ — ہوتا جن کی شامت ہی آگئی ہو

مکر سے مراد خفیہ پکڑ ہے۔ مومن خدا کی فرمانبرداری کرتا ہے اور خدا کی ذات سے عفو و درگذر کی توقع رکھتا ہے نہ اسے اعمال صالحہ پر غرہ ہوتا ہے کیونکہ وہ کفر سے ہمہ وقت خائف رہتا ہے اور نہ وہ ناامیدی ہی کا شکار ہوتا ہے غرہ اس لئے نہیں کہ اعمال صرف امید دلا سکتے ہیں، فرمانبرداری کے باوصف اپنے اندرون کی خبر نہیں ہے اندرونی پسردے بہت ہیں، سر، خفی، اخفی، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی درجہ معصیت کا آجائے صرف ظاہر ہی پر تو مدار نہیں

بغض ہو، سابق حدیث میں ارشاد فرمایا تھا کہ ــــ ان یحب المرء لا یحبہ الا للہ ــــ پھر اس محبت اور اخلاص کا مستحق کون ہوسکتا ہے، ظاہر ہے کہ مستحق وہی ہوسکتا ہے جس نے اللہ کی راہ میں سرفروشانہ خدمات انجام دی ہوں، اسی لئے حصر ادعائی کے طور پر فرماتے ہیں ــــ علامۃ الایمان حب الانصار ــــ خواہ یہ حصر خبر فی المبتدا ہو یا حصر مبتدا فی الخبر۔ بہر کیف مفہوم یہی ہے کہ چونکہ یہ حضرات دین پیغمبر علیہ السلام کے ناصر ہوئے ہیں اور اس کی اشاعت کے لئے کوشش کی ہے اس لئے ان کی محبت ایمان کا تقاضا ہے

انصار مدینہ، مکہ کے لوگوں سے ڈرتے تھے مکہ کے لوگ بڑے باہمت تھے، یہ کہا کرتے تھے کہ ہمیں اللہ نے پاسبان حرم بنایا ہے اور اس کے لئے ہمیں حماست وشجاعت عطا فرمائی ہے اور یہ لوگ، مدینہ والوں کو کاشتکار کہا کرتے تھے، جب تمام قبائل نے تبلیغ کو روک دیا، اور پیغمبر علیہ السلام کی دعوت کے ساتھ روگردانی کی گئی اور پیغمبر علیہ السلام کو ان لوگوں سے مایوسی ہوگئی تو آپ نے موسم حج میں عقبہ والوں کو دعوت دی، ان لوگوں کی سمجھ میں بات آگئی۔ کیونکہ یہود مدینہ میں آباد تھے اور کہا کرتے تھے کہ اب نبی آخر الزماں آنیوالے ہیں، ہم ان کے ساتھ مل کر ان مشرکین کا قلع قمع کردیں گے، جب ان لوگوں نے اپنی آنکھوں سے نبی آخر الزماں کو دیکھ لیا تو ایمان ان کے دل میں بیٹھ گیا اور ان لوگوں نے یہ سوچا کہ ہمیں یہود سے پہلے قبول کرلینا چاہئے، یہ تقریبًا چھ آدمی تھے۔ اس سے اگلے سال بارہ سرداران قوم کی تعداد آئی پیغمبر علیہ السلام نے انہیں بھی دعوت اسلام دی اور انہوں نے بھی بطیب خاطر اسلام قبول کیا۔ تیسرے سال بہتّر آدمی آئے اور چھپ چھپا کر عقبہ میں جمع ہوئے کہ قریش کو خبر نہ ہو۔ اور آپ کو مدینہ آنے کی دعوت دی کہ اگر آپ ہمارے یہاں تشریف لائیں گے تو ہم جان و مال تک کی بازی لگادیں گے۔ حضرت عباس اس موقعہ پر موجود تھے فرمایا کہ تم انہیں لیجانا چاہتے ہو ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا، ان کو بلانا پورے عرب کو دعوت محاربت دینا ہے لیکن انصار نے بڑی پختگی سے کہا حتی کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو یقین ہوگیا کہ انصار واقعۃً آپکو دعوت دے رہے ہیں۔

پھر آں حضور کے تشریف لیجانے کے بعد ان انصار نے جس جاں نثاری کا ثبوت پیش کیا وہ نہ صرف یہ کہ اپنے وعدہ کا ایفا تھا بلکہ اس سے بھی کچھ سبقت تھی، گو اہل مکہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ کاشتکار ہمارا کیا مقابلہ کریں گے لیکن پیغمبر علیہ السلام کی نگاہ کیمیا اثر نے انہیں مقتدائے جہاں بنادیا، اور ان حضرات ہی کی قربانیوں سے مدینہ میں آکر اسلام کو فروغ ہوا۔ اسی لئے پیغمبر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے

ان الانصار کرشی و عیبتی (مسلم باب فضائل الانصار ص ۳۰۴ ج ۲) انصار میرا معدہ اور جامہ دان ہیں

انصار میرا جامہ دان اور معدہ ہیں۔ معدہ میں غذا پکتی ہے ایک اور جگہ ارشاد ہے

الانصار شعار والناس دثار (مسند احمد ص ۷۶ ج ۳) انصار کی حیثیت جسم کے اندرونی کپڑے کی ہے اور لوگوں کی برونی کپڑے کی

ہے بلکہ خدا کی اطاعت سے انحراف بھی گمراہی ہے اور رسول کی اطاعت سے بھی۔ اس لئے وہاں الگ الگ ہی بیان کرنا چاہئے تھا۔ اسی وجہ سے تنبیہ کی نوبت آئی کہ تمہیں خطبہ دینا نہیں آتا

بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ اگر پیغمبر علیہ السلام کی زبان سے جمع ہو تو اس میں کسی قسم کا ایہام نہیں ہے لیکن اگر غیر رسول کی زبان سے جمع ہو تو اس میں یہ ایہام ہو سکتا ہے کہ دونوں کو ایک مقام دے رکھا ہے۔ بس اس ایہام سے بچانے کے لئے آپ نے خطیب کو تنبیہ فرمائی تھی

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ خطیب کو تنبیہ کی وجہ اللہ اور رسول کو ایک ضمیر میں جمع کر دینا نہ تھی بلکہ تنبیہ تو اس کے الفاظ کی ادائیگی پر کی گئی تھی، دراصل اس نے خطبہ یوں پڑھا تھا ——— من يطع الله ورسوله فقد رشد ومن يعصيهما ——— بس یہاں سانس توڑ دیا اور سکتہ کے بعد کہا۔ فقد غوى ——— اب ترجمہ یہ ہو گیا کہ جو اللہ کی اطاعت کرے وہ راشد ہے اور جو معصیت کرے وہ بھی۔ اس طرز ادا سے بہت بڑا نقصان پیدا ہو رہا تھا اس لئے آپ نے تنبیہ فرما دی، امام طحاوی نے مشکل الآثار میں یہی لکھا ہے

بَابُ عَلَامَةِ الْإِيمَانِ حُبُّ الْأَنْصَارِ حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ أَخْبَرَنِي عَبْدُ اللهِ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ جَبْرٍ قَالَ سَمِعْتُ أَنَسًا رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ آيَةُ الْإِيمَانِ حُبُّ الْأَنْصَارِ وَآيَةُ النِّفَاقِ بُغْضُ الْأَنْصَارِ

باب انصار کی محبت ایمان کی علامت ہے ——— ابو الولید نے حدیث بیان کی فرمایا ہم سے شعبہ نے حدیث بیان کی، انہوں نے فرمایا کہ ہم سے عبداللہ بن عبداللہ بن جبر نے خبر دی کہ انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سنا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انصار کی محبت ایمان کی علامت ہے اور انصار سے بغض نفاق کی نشانی ہے

تشریح حدیث مطلب یہ ہے کہ یوں تو ہر شخص اپنے ایمان کا مدعی ہے کلمہ ——— لا الٰہ الا اللہ ——— ہر شخص بڑے جوش وخروش سے پڑھتا ہے لیکن کوئی شناخت ایسی ہونی چاہئے جس سے انسان کے اخلاص کو دیکھا اور پرکھا جا سکے، اس علامت کی ضرورت اس دور میں اس لئے بھی زیادہ تھی کہ دوسرے تمام اعمال ظاہرہ نماز، حج وغیرہ میں منافقین بھی مومنین کے ساتھ لگے رہتے تھے اس لئے امتیازی علامت کیسے سمجھا جا سکتا، پیغمبر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ انصار کی محبت ایمان کی علامت ہے یعنی انصار سے اس اعتبار سے محبت کہ انہوں نے اس دین کی نصرت کی ہے، دین سے وہی شخص علاقۂ محبت رکھ سکتا ہے جسے دین اور صاحب دین سے محبت ہوگی، اسی طرح انصار دین سے بغض بھی وہی رکھ سکتا ہے جسے دین اور صاحب دین سے

اللہ عنہ نے جو بدر میں حاضر ہوئے تھے اور جو لیلۃ العقبہ کے نقیبوں میں سے ایک تھے بتلایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی ایک جماعت کے درمیان فرمایا کہ تم مجھ سے ان باتوں پر بیعت کرو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ گے اور چوری نہ کرو گے اور زنا نہ کرو گے اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے اور بہتان تراشی نہ کرو گے جسے تم اپنے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان گھڑو اور نیک کاموں میں نافرمانی نہ کرو گے پھر تم میں سے جو شخص اپنا پیمان پورا کر دے اس کا اجر اللہ پر ہے اور اگر کوئی ان باتوں میں سے کوئی حرکت کر بیٹھے اور پھر اسی دنیا میں اسے سزا بھی مل جائے تو یہ اس کے لئے کفارہ ہو گیا اور اگر کوئی (شرک کے علاوہ) ان چیزوں میں سے کوئی حرکت کر بیٹھے پھر اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی فرمالے تو اسکا معاملہ اللہ کے سپرد ہے خواہ معاف فرما دے خواہ سزا دے۔ حضرت عبادہؓ نے فرمایا کہ ہم نے ان باتوں آپ سے بیعت کی

باب کا مقصد امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں صرف باب لکھا ہے اور کوئی ترجمہ منعقد نہیں فرمایا۔ بلکہ بعض نسخوں میں تو باب بھی نہیں ہے، اگر اس دوسرے نسخہ کو لیں تو ترجمہ تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں، البتہ اگر اس نسخہ کو لیں جس میں باب موجود ہے تو دیکھنا یہ ہوگا کہ مصنف نے خلاف عادت ترجمہ کیوں منعقد نہیں فرمایا حالانکہ مقصد ترجمہ ہی سے معلوم ہوتا ہے، یہ پہلا موقعہ ہے، ایسے مواقع پر مختلف چیزیں ذکر کی جاتی ہیں، مثلاً بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ارادہ تھا مگر تکمیل سے قبل وفات ہو گئی، اس کا مفہوم یہ ہے کہ مصنف نے پہلے احادیث لکھیں اور پھر تراجم قائم کئے ہیں اور چونکہ یہ عنوانات بعد کی چیز ہیں اس لئے بہت سے حصہ پر قائم ہو گئے لیکن کچھ حصہ ایسا بھی رہ گیا جس پر تراجم قائم کرنے کی نوبت نہ آسکی

یہ بات معقول ہوتی اگر ایسے تمام ابواب جن پر تراجم نہیں آخر میں ہوتے لیکن یہاں کا معاملہ یہ ہے کہ کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں بلا ترجمہ کے کچھ ابواب مذکور نہوں اس لئے یہ توجیہ درست نہیں معلوم ہوتی

بعض حضرات نے کہا کہ خود مولف نے تو تراجم رکھے تھے مگر ناقلین سے رہ گئے۔ اور بعض حضرات نے کہا کہ یہ امام کا سہو ہے کیونکہ یہ کتاب دور تالیف میں امام نے اس طرح نہیں لکھی تھی جس طرح ہمارے سامنے موجود ہے بلکہ احادیث مختلف اوراق پر لکھی ہوئی تھیں امام ایک ایک ورق اٹھا کر تراجم قائم فرماتے جاتے تھے، ایسی صورت میں ممکن ہے کہ ورق الٹ جائے اور کوئی حدیث نظر سے چوک جائے لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں

ناقلین سے چھوٹنے کا بھی کوئی احتمال نہیں کیونکہ نقل مسلسل ہو رہی ہے، بار بار ہو رہی ہے اور مصنف رحمہ اللہ کی حیات میں ہو رہی ہے، نیز امام پر سہو کا الزام بھی امام کی جلالت شان سے بے خبری کی دلیل ہے، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ایسے ایسے سہو مولف کو بہت ہوئے ایک دو جگہ سہو ہو جائے تو خیر کوئی بات نہیں لیکن جگہ جگہ بھولنے والا انسان کس طرح قابل اعتماد ہو سکتا ہے جو ترجمہ منعقد کرنا بھول سکتا ہے وہ حدیث بھی بھول سکتا ہے، پھر

آپ نے انصار کے بارے میں ایک بار فرمایا

ولو سلك الناس واديا وسلكت	اگر لوگ ایک وادی میں چلیں اور انصار دوسری
الانصار واديا او شعبا لسلكت وادى	وادی یا گھاٹی میں چلیں تو میں انصار کی وادیا
الانصار او شعب الانصار (بخاری کتاب التمنی ص۱۰۷۱)	گھاٹی میں چلونگا

رہا مہاجرین کا معاملہ وہ اپنی جگہ بہت افضل ہیں ظاہر ہے کہ انہوں نے اسلام کے لئے وطن تک چھوڑ دیا اموال واملاک کو تج دیا، تمام آرام وآسائش سے روگردانی کی، خود ہجرت ہی کی اتنی فضیلت ہے کہ دوسری تمام فضیلتیں اس کے مقابل نہیں آسکتیں، آپ نے ارشاد فرمایا

لو لا الهجرة لكنت امرءًا من	اگر ہجرت (کی فضیلت) نہ ہوتی تو میں اپنا
الانصار (بخاری باب قول النبی لولا الہجرۃ ص۵۳۳ ج۱)	شمار انصار میں کراتا

اس لئے اتنی قربانیاں دینے والوں کے بارے میں تو کلام ہی نہیں ہو سکتا، پھر یہ بھی کہ مہاجرین بیشتر خانوادۂ نبوی سے ہیں اس لئے ان کی محبت میں کوئی خفا ہی نہیں ہو سکتا، البتہ انصار کے متعلق غیرت کا خیال کیا جا سکتا تھا اس لئے آپ نے ارشاد فرمایا کہ انصار کی محبت ایمان کی نشانی ہے، لیکن یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ انصار سے بغض اور محبت دونوں کے بارے میں ان کی شان نصرت کارفرما ہے

بابٌ — حَدَّثَنَا اَبُو الْيَمَانِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ اَخْبَرَنِيْ اَبُوْ اِدْرِيْسَ عَائِذُ اللّٰهِ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّ عُبَادَةَ بْنَ الصَّامِتِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَكَانَ شَهِدَ بَدْرًا وَهُوَ اَحَدُ النُّقَبَاءِ لَيْلَةَ الْعَقَبَةِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَحَوْلَهُ عِصَابَةٌ مِّنْ اَصْحَابِهِ بَايِعُوْنِيْ عَلٰى اَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا تَسْرِقُوْا وَلَا تَزْنُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ وَلَا تَاْتُوْا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْصُوْا فِيْ مَعْرُوْفٍ فَمَنْ وَفٰى مِنْكُمْ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوْقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَهُوَ اِلَى اللّٰهِ اِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَاِنْ شَاءَ عَاقَبَهٗ فَبَايَعْنَاهُ عَلٰى ذٰلِكَ۔

ترجمہ — باب ۔ ابوالیمان نے حدیث بیان کی فرمایا کہ ہمیں شعیب نے زہری سے حدیث بیان کی، زہری نے فرمایا کہ مجھے ابوادریس عائذ اللہ بن عبداللہ نے بتلایا کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی

یہ باب کالفصل من الباب السابق بھی ہو سکتا ہے اور تشحیذ اذہان کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ باب سابق سے تعلق تو ظاہر ہے کیونکہ وہاں — علامۃ الایمان حب الانصار — کہا گیا تھا اور یہاں انصار کی وجہ تسمیہ بتلائی یہاں بعض لوگوں نے یہی کہا ہے کہ سابق ابواب میں ایمان ہی کے متعلقات واجزاء کا ذکر تھا کہیں اجزاء مکملہ کا ذکر تھا اور کہیں اجزاء تزئینیہ کا۔ اور اس حدیث میں ایمان کا ذکر ہی نہیں ہے بلکہ انصار کی وجہ تسمیہ مذکور ہے۔ اس لئے اسے باب سابق ہی سے متعلق کہا جا سکتا ہے لیکن قطعی طور پر یہ کہنا کہ اس حدیث میں ایمان کا ذکر نہیں درست نہیں ہے کیونکہ — بایعونی — سے آخر حدیث تک ایسی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ایمان کے لئے مضر ہیں۔ یہ تو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ بیشتر ابواب میں امام بخاری کا مطمح نظر مرجیہ کی تردید ہے اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ مرجیہ اعمال کو خلاد ترکا غیر ضروری قرار دیتے ہیں، اور اس روایت میں موجود ہے — لا تسرقوا — یعنی چوری کرنا ایمان کو مضمحل کر دیتا ہے اور اس کے بعد قتل اولاد، زنا کاری، بہتان بندی، سے روکا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب بری باتیں ہیں اور سب ایک ہی خط پر ہیں انکا جائز سمجھنا کفر ہے۔ اس سے صاف طریقہ پر مرجیہ کی تردید ہو رہی ہے کہ منہیات کو ایمان کے لئے مضر نہ سمجھنا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کے خلاف ہے۔ اسی تردید کے لئے یہاں ہر ہر جزء ترجمہ بن سکتا ہے۔ مثلاً ترك القتل من الایمان — اور — الاجتناب عن القتل من الایمان — اور — من الایمان ترك البهتان وغیرہ، وغیرہ، رہا ان ایمانیات کے باوجود ترجمہ منعقد نہ کرنا، یہ محض تشحیذ اذہان کے لئے ہے، گویا یہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ دیکھو اس حدیث میں ایسی متعدد چیزیں ہیں جنکا چھوڑنا ایمان میں داخل ہے اور جن کے اختیار کرنے سے ایمان کمزور ہوتا ہے، ان کو عقیدۃً درست سمجھنا کفر ہے اب تمہیں اختیار ہے جس جز کے متعلق چاہو ترجمہ رکھ لو

کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ امام ترجمہ اس لئے منعقد نہیں کرتے کہ حدیث میں متعدد فوائد ہوتے ہیں، امام چاہتے ہیں کہ ترجمہ ذکر کر کے حدیث کو کسی ایک فائدہ پر منحصر نہ کر دیں۔ بلکہ جس قدر بھی فوائد حاصل ہو رہے ہیں ان سب کی گنجائش رہے امام بخاری کی روش تو معلوم ہی ہے کہ وہ فرق باطلہ کا رد کرنا چاہتے ہیں۔ ان فرق میں پہلا نمبر مرجیہ کا ہے اور دوسرا نمبر خوارج، معتزلہ کا، امام رحمہ اللہ نے ایک ایسی حدیث پیش فرمادی جس میں مرجیہ، کرامیہ اور خوارج و معتزلہ سب ہی کی تردید ہو سکتی ہے یعنی اس حدیث سے سمجھ میں آتا ہے کہ اعمال۔ ایمان کے اندر مطلوب ہیں نیز یہ کہ اعمال کی جزئیت اس درجہ کی بھی نہیں جسکا دعوی معتزلہ و خوارج نے کیا ہے کیونکہ ارشاد ہے

من اصاب من ذلك شيئا ثم ستره الله	جو شخص کہ ان چیزوں میں سے کسی کا مرتکب ہو پھر اللہ
فهو الى الله ان شاء عفا عنه وان شاء	تعالیٰ اس کی پردہ پوشی فرمالیں تو اس کا معاملہ اللہ
عاقبه -	کے سپرد ہے خواہ معاف فرمادے خواہ سزا دے

یعنی گناہ کرنے سے مومن ایمان سے خارج نہیں ہو جاتا بلکہ گناہ کے بعد معاملہ خداوند قدوس کی مشیت کے تحت

نقل میں غلطی یا امام رحمہ اللہ سے سہو کا احتمال اس لئے ختم ہو جاتا ہے کہ کتاب کی تالیف کے بعد امام سے نوے ہزار طلبہ نے احادیث حاصل کیں، کیا اس نوے ہزار کی غیر معمولی تعداد کی تعلیم کے دوران کبھی نظرثانی کی نوبت نہیں آئی کہ فروگذاشتوں کی اصلاح ہو جاتی، اس لئے ماننا پڑیگا کہ نہ امام کی وفات کا عذر درست ہے نہ ناقلین کے سر غلطی کا الزام درست ہے اور نہ امام کی طرف سہو کی نسبت ہی درست ہے

صحیح یہ ہے کہ بعض مقامات پر دانستہ امام نے تراجم منعقد نہیں فرمائے ہیں جس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ حدیث کا تعلق باب سابق سے ہے لیکن ایک جدید امر کا بھی افادہ ہو رہا ہے اگرچہ وہ مستقل چیز نہیں ہے ایسی صورت میں انعقاد باب کے بعد ترجمہ منعقد نہ کرنے کا یہ مفہوم ہے کہ ابھی پہلا مضمون بھی ختم نہیں ہوا ہے اور اسی سے ایک اور بات بھی اخذ کیجا سکتی ہے جس پر لفظ باب سے تنبیہ کی جا رہی ہے جیسے [1] استاذ پڑھاتے پڑھاتے نئی چیز پر متوجہ کرنے کے لئے تنبیہ کہہ دیتا ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ بھی باب کو تنبیہ کی جگہ استعمال کرتے ہیں کہ دیکھو یہ نئی چیز ہے ادھر توجہ رہنی چاہیئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی بعض تراجم کے متعلق یہی فرمایا ہے اور بعض تراجم کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ از قبیلہ باب فی الباب ہیں، ایسی صورت میں ضروری ہے کہ باب کے تحت ذکر کردہ حدیث سابق باب یا حدیث سے بھی متعلق رہے اور ان دونوں میں کوئی امر فاصل بھی رہے، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ اور قسطلانی باتباع حافظ اکثر مقامات پر کالفصل من الباب السابق فرماتے ہیں یعنی یہ بالکل الگ بھی نہیں اور بالکل متحد بھی نہیں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ حافظ کا ہر موقعہ پر کالفصل کہدینا صحیح نہیں ہے۔ جہاں ترجمہ کا حدیث سابق سے ارتباط ظاہر ہو وہاں تو یہ درست ہے لیکن اگر تعلق نہ ہو تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ امام تشحیذاً للاذہان ایسا کر رہے ہیں۔ تشحیذ۔ تیز کرنا، یعنی چند ابواب کو تراجم کے ساتھ ذکر کرکے جو اس باب کو بلا ترجمہ لاتے ہیں اسکا یہ مقصد ہوتا ہے کہ جس طرح میں نے تراجم رکھے ہیں اسی طرح تم بھی انکی روشنی میں طبیعت پر زور ڈالکر ترجمہ لگانے کی کوشش کرو، یہ تشحیذ اذہان امام بخاری کی شان کے مناسب بھی ہے کیونکہ آگے ترجمہ رکھیں گے کہ معلم کو وقتاً فوقتاً طلبہ کا امتحان لیتے رہنا چاہیئے تاکہ طالب علم غفلت نہ برتے اور استاذ کو بھی طالب علم کی استعداد کا پتہ رہے اور ظرف واستعداد کے مطابق تعلیم دی جا سکے

---

[1] حضرۃ الاستاذ زید مجدہم نے اس موقعہ پر ارشاد فرمایا کہ جب حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ دارالعلوم تشریف لائے تو دوایہ آخرین ان سے متعلق کی گئی۔ حضرت علامہ رحمہ اللہ کی زبان پر بلا ساختہ عربی کے الفاظ آجاتے تھے حتی کہ جلدی تو طلبہ کو مناسبت بھی نہ ہو پاتی تھی، ان دنوں علامہ کشمیری رحمہ اللہ درس دیتے دیتے فرمایا کرتے تھے۔ تنبیہ۔ اس عنوان سے فراغت کے بعد فرماتے۔ فرع۔ اور پھر فروعات کا بیان شروع ہوتا۔ حضرۃ الاستاذ مدظلہم نے شاں میں یہ تنبیہ کا لفظ حضرت علامہ رحمہ اللہ کے اس انداز تدریس سے لیا ہے

صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ کی غرض سے ان لوگوں کے پاس تشریف لائے، ان لوگوں نے عرض کیا کہ ہمارے چند آدمی باہر گئے ہوئے ہیں، ہم لوگ ان کے آنے کے بعد مشورہ کرلیں، آپ رات میں تشریف لائیں، مشورہ میں طے پایا کہ اس موقعہ کو غنیمت سمجھو، معلوم ہوتا ہے یہ وہی پیغمبر ہیں کہ جن کے ساتھ مل کر یہود ہمیں استیصال کی دھمکی دیتے ہیں، چنانچہ جب رات کو آپ تشریف لے گئے تو ان لوگوں نے دعوت قبول کرلی

حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی ان خصوصیات سے یہ معلوم ہوگیا کہ بیان معمولی شخص کا نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسے شخص کا ہے جو ہر طرح قابل استناد ہے، فرماتے ہیں کہ لیلۃ العقبہ میں پیغمبر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ تم مجھ سے ان چیزوں کے ترک پر بیعت کرو، پہلی بات تو یہ ہے کہ تم خدا کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ گے، اس شرک کی نفی میں شرک فی الذات، شرک فی الصفات، اور شرک فی العبادات سب ہی آجاتے ہیں، اس بات پر بیعت کرو کہ زنا نہ کروگے اولاد کو قتل نہ کروگے، بہتان تراشی نہ کروگے، بہتان وہ جھوٹ ہے جس کی کوئی اصلیت نہ ہو، صرف ہاتھ پیر کے درمیان ایک چیز بنادی گئی ہو۔ بین ایدیکم وارجلکم ۔ دل سے کنایہ ہے یعنی دل نے ایک بے حقیقت بات گھڑلی اور بعض حضرات نے ۔ بین ایدیکم وارجلکم ۔ کے معنی زنا کے لئے ہیں یعنی زنا کے ذریعہ عورت نے اولاد حاصل کی، اور شوہر کے ذمہ لگادی۔ اسی طرح ایک منکوحہ کے بطن سے پیدا شدہ انسان کے متعلق حرامی ہونے کا بہتان لگادینا بھی اس میں داخل ہے

آگے فرماتے ہیں کہ یہ تو چند چیزیں بتادی گئی ہیں، اصولی بات یہ ہے کہ ۔ لا تعصوا فی معروف ۔ کسی بھلی بات میں نافرمانی کی گنجائش نہیں ہے ۔ لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ اللہ[1] ۔ اطاعت ہمیشہ معروف میں ہوگی، معروف ہر وہ چیز ہے جو شریعت کی نگاہ میں جانا پہچانا اور منکر وہ ہے جو شریعت کی نگاہ میں جانا پہچانا نہ ہو۔ فمن وفی منکم فاجرہ علی اللہ ۔ اگر کسی نے ان باتوں کو پورا کردیا تو اس کا ثواب خدا کے ذمہ ہے یعنی خداوند قدوس نے اپنے کرم سے اہل طاعت کے لئے ایک وعدہ فرمالیا ہے اور چونکہ کریم کا وعدہ پورا ہوتا ہے اس لئے اس کی تعبیر ۔ علیٰ ۔ کے ذریعہ کی گئی یعنی خدا نے اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ اگر کوئی پابندی کریگا تو اسے اجر دیں گے، اور کوئی شخص اگر امور مذکورہ میں سے کسی کا مرتکب ہوگیا اور پھر اسکو سزا بھی دیدی گئی، تو وہ دنیوی حیثیت سے بدلہ ہوجائیگا، اور اگر کسی شخص نے جرم کا ارتکاب کیا مگر خداوند قدوس نے پردہ ڈھکا رکھا تو معاملہ اللہ کے سپرد ہے خواہ معاف فرمادے خواہ سزا دے یعنی یہ خیال نہ کیا جائے کہ جب خدا نے دنیا میں پردہ ڈھکا رکھا ہے تو وہ آخرت میں بھی ایسا ہی کریگا، بلکہ معاملہ اللہ کے سپرد ہے خواہ معاف فرمادے خواہ سزا دے، کفار یہی کہا کرتے تھے کہ اگر خدا ہم سے ناراض ہوتا تو ہمارے گناہوں کی سزا دیتا، کوئی کہتا کہ کریم جب کسی کو انعامات سے نوازتا ہے تو کمی نہیں کرتا، بلکہ بڑھاتا ہی چلاجاتا ہے اس لئے اکرم الاکرمین سے یہ امید نہیں ہوسکتی کہ وہ یہاں تو انعامات کی

[1] مسند احمد صفحہ ۶۶ ج ۵

آجاتا ہے اور اگر خداوند قدوس کی رحمت دستگیری فرمائے تو صحابی بھی ہوسکتی ہے

تشریح حدیث انصار مدینہ، مدینہ کے باشندے نہ تھے بلکہ انہیں بنو قیلہ کہا جاتا تھا جب سبا پر تباہی آئی تو ایک کاہنہ نے اطلاع دی کہ عنقریب ایک عذاب آنیوالا ہے اور اگر تم اپنی حفاظت چاہتے ہو تو یہاں سے نکل جاؤ چنانچہ قبیلۂ سبا کے لوگ اور یہ بنو قیلہ ادھر ادھر منتشر ہو گئے، کچھ لوگ شام میں جا ٹھہرے اور اوس و خزرج مدینہ میں اقامت پذیر ہو گئے، اس وقت مدینہ پر یہود کا تسلط تھا اور ان میں بنو قینقاع، بنو نضیر، اور بنو قریظہ سر براہ تھے، بنو قینقاع لہاری کا پیشہ کرتے تھے، اور یہ ان سب میں بہادر تھے ان کو اپنی تیغ زنی پر اعتماد تھا، جب قبیلۂ اوس و خزرج نے چاہا کہ انہیں مدینہ میں اقامت کی اجازت دی جائے (اور بعض ضعیف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ نبی آخر الزماں کا مہاجر مدینہ ہوگا) تو ان متسلط اقوام نے یہ شرط لگادی کہ اس طرح تم یہاں اقامت کر سکتے ہو کہ جب بھی تمہارے یہاں کوئی شادی ہو دلہن کو پہلی رات میں ہمارے یہاں بھیجنا ہوگا، ان لوگوں نے یہ شرط قبول کرلی لیکن واقعہ یہ پیش آیا کہ جب شادی ہوئی تو عورت منہ کھولکر مجمع کے سامنے آگئی، مجمع میں اس کے بھائی، بھتیجے اور دوسرے اعزار موجود تھے، ان لوگوں نے عورت کو عار دلائی کہ اس بے حجابی پر تجھے شرم نہیں آتی عورت نے کہا کہ تمہیں ڈوب مرنا چاہیئے مجھے غیر شوہر کے سپرد کرنے پر رضامند ہو

بات تیر کی طرح لگی، جذبات مشتعل ہو گئے اور ان پست اقوام نے بھی تیاری شروع کردی جنگ ہوئی لیکن اقتدار کسی کی میراث نہیں ہے، خداوند قدوس نے یہود کو پسپا کر دیا، یہود مغلوب ہو گئے تو اوس و خزرج سے کہا کرتے تھے کہ ہمیں تمہاری اس تعدی کے جواب کے لئے نبی آخر الزماں کا انتظار ہے، ان کے ظہور کے بعد ہم تمہاری ان حرکات کا جواب دیں گے، یہود کے اس طعنہ سے اوس و خزرج بھی آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے چشم براہ تھے، موسم حج میں جب ان لوگوں کے کانوں تک آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی اطلاع ملی اور آپ کی جانب سے ان لوگوں کو دعوت بھی دی گئی تو انہوں نے فوراً اسے قبول کرلیا تاکہ یہود سے پیچھے نہ رہ جائیں اور پھر ایمان قبول کرنے کے بعد جو زریں خدمات ان لوگوں نے انجام دیں وہ تاریخ کے صفحات میں دنیا کے سب سے بڑے انقلاب کے نام سے محفوظ ہیں، انہیں خدمات کے صلہ میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام بنو قیلہ سے انصار تجویز فرمادیا، اور اسی لئے علامۃ الایمان حب الانصار ارشاد فرمایا۔

حضرت عبادہ بن صامت کا بیان ہے جو اپنی دو خصوصیتوں کی بنا پر اسلام میں بہت ممتاز ہیں، ایک تو یہ کہ انہیں بدر میں حاضری میسر آئی جو بڑی فضیلت ہے[1] اہل بدر کی مغفرت کے متعلق قرآن نے بھی اعلان کر دیا ہے، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حضرت عبادہ ان نقیبوں میں سے ایک ہیں جو لیلۃ العقبہ میں پیغمبر علیہ السلام کی بیعت میں حاضر تھے یعنی جب حج کا زمانہ آیا اور انصار کے کچھ لوگ حج کے لئے مکہ پہونچے، تو آں حضور

[1] کذا جلد اول

یہ معاملہ صرف ظاہر کا ہے، رہا باطن کا معاملہ، وہ اللہ کے سپرد ہے. صرف اقامتِ حد سے وہ مسئلہ حل نہیں ہو جاتا، زانی کو سزا ہو جاتی ہے مگر پھر اسی جرم کا ارتکاب کر لیتا ہے معلوم ہوا کہ حد لگنے سے تطہیر کا ہو جانا ضروری نہیں. بلکہ اس کی صورت یہ ہے کہ انسان اپنے فعل پر ندامت کا اظہار کرے اور اس فعل سے الگ ہو کر آئندہ کے لئے الگ رہنے کا عہد کرے، البتہ اگر ایسی صورت ہے کہ توبہ ہی اقامت حد کا پیش خیمہ ہے، یعنی گناہ کے بعد ندامت ہوئی اور اس کے نتیجہ میں خود اس نے گناہ کا اعتراف کر کے حد جاری کرائی ہے تو اس کے معاملہ کی صفائی میں تو کوئی اشتباہ ہی نہیں ہے، اور اگر ایسا ہوا ہے کہ جرم چھپ کر کر رہا تھا. اتفاقات کھل گئی، اور اقامتِ حد کی بھی نوبت آگئی تو اس کے لئے حد کے ساتھ ساتھ توبہ اور ندامت کی بھی ضرورت ہے

حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ نے اقرار کیا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ٹالتے رہے، بار بار احتمال پیدا فرماتے لیکن حضرت ماعز رضی اللہ عنہ اپنے اقرار پر پختہ رہے، آپ نے حد جاری فرمادی، اس کے بعد کسی نے حضرت ماعز کی شان میں نامناسب الفاظ استعمال کئے تو آپ نے تنبیہ فرمائی کہ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے جان دیدی. امراۃ غامدیہ نے زنا کا اقرار کیا جب بات پوری طرح ثابت ہوگئی تو آپ نے فرمایا کہ حاملہ کو رجم نہیں کیا جاسکتا، ولادت کے بعد آنا، موقعہ تھا کہ گھر میں بیٹھ جاتیں کسی اور جگہ چلی جاتیں لیکن ولادت کے بعد پھر حاضر خدمت ہوئیں، کہ حضور! پاک فرمادیجئے، آپ نے فرمایا رضیع کو رجم نہیں کیا جاسکتا جب بچہ کھانے لگے تب آنا یہ سن کر واپس آگئیں اور کوشش کی کہ بچہ جلد ٹکڑا کھانے لگے، اور جب دوبارہ آئیں تو بچہ کے ہاتھ میں ٹکڑا تھا عرض کیا حضور ٹکڑا کھانے لگا ہے، بچہ دوسرے کو دیدیا گیا اور رجم کر دیا گیا. آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نے اتنی بڑی توبہ کی ہے کہ اگر تمام اہل مدینہ پر تقسیم ہو جائے تو کافی ہو اور رجم کے وقت انہوں نے کہا کہ میں ماعز نہیں ہوں حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کا واقعہ یہ ہے کہ رجم کے وقت جب تکلیف ہوئی تو بھاگنے لگے، ان دونوں موقعوں پر توبہ ہی اقامت حد کا سبب بنی ہے، اس حد کے کفارہ ہونے میں کوئی اشتباہ نہیں ہے لیکن ایک ایسا شخص ہے جو جرم چھپا کر کرتا ہے کسی کو اطلاع ہوگئی، شکایت ہوگئی بات پایہ ثبوت کو پہونچ گئی اور حد جاری کر دی گئی اب سوال پیدا ہوگا کہ اس شخص پر جو حد جاری کی گئی ہے وہ کفارہ ہے یا نہیں، کیونکہ بعض حضرات جرم کی اہمیت محسوس کرتے ہیں اور بعض حضرات نہیں کرتے، جو حضرات جرم کی اہمیت محسوس نہیں کرتے ان کے لئے صرف حد کا قائم ہو جانا کافی نہ ہوگا بلکہ توبہ اور ندامت کی ضرورت ہے

ایک شخص حاضر ہو کر عرض کرتا ہے حضور مجھے پاک فرمادیجئے، جرم تقبیل اجنبیہ کا ہے سمجھ رہا ہے کہ اجنبیہ کی تقبیل بھی جرم ہے اور زنا کے برابر ہے، حدیث شریف میں ہے

کتب علیٰ ابن آدم نصیبہ من الزنا ——— انسان پر زنا کا حصہ مقدر ہو چکا ہے جس کو

لہ مسلم ص۳۳۶ ج۲ ۱۲

بارش کرے اور قیامت میں یکسر محروم کردے اسی قسم کے باطل خیالات کی تردید کے لئے فرمایا گیا کہ معاملہ اس کے قبضہ میں ہے. معاف بھی کرسکتا ہے اور سزا بھی دے سکتا ہے

حدود کفارہ ہیں یا نہیں | یہاں ایک مسئلہ حدود کے کفارہ ہونے اور نہ ہونے کا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ احناف اور شوافع کا مختلف فیہ مسئلہ ہے شوافع کا خیال ہے کہ حدود میں کفارہ ہونے کی شان ہے یعنی اقامت حد کے بعد جرم دنیا و آخرت دونوں میں ڈھک جاتا ہے اور قلب میں جو برائی پیدا ہوئی تھی وہ بھی ختم ہو جاتی ہے یعنی ظاہراً و باطناً معاملہ صاف ہو جاتا ہے. احناف کہتے ہیں کہ حد کا منشا یہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں بلکہ اگر مجرم کو سزا مل گئی تو دنیوی جرم ختم ہو گیا اب زانی کو یا زانی کہکر پکارنا روا نہیں ہے. رہا آخرت کے مواخذہ کا سوال، اس کا ختم ہو جانا یقینی نہیں ہے بلکہ اخروی مواخذہ کو ختم کرنے کے لئے صدق دل سے توبہ کرنا ضروری ہے. گویا شوافع کے نزدیک حد ہی توبہ کے قائمقام ہے اور احناف حد کے بعد بھی توبہ کو ضروری قرار دیتے ہیں. حضرات شوافع کے پاس استدلال میں ایک تو یہ حدیث. فهو كفارة له. ہے اور دوسری دلیل ظہار کے بارے میں ایک آیت

فصيام شهرين متتابعين توبة من الله ۵ پ ۱۰	متواتر دو ماہ کے روزے ہیں بہ طریق توبہ کے جو اللہ کی طرف سے مقرر ہوئی ہے

یعنی روزے رکھ لینا ہی توبہ ہے. گویا صراحت کے ساتھ آیت نے یہ بتلا دیا کہ حدود میں گناہ کی گندگی کو صاف کردینے کی صلاحیت موجود ہے پھر یہ کہ حدیث شریف میں اس شخص سے تقابل کیا گیا ہے جس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، خواہ معاف کرے خواہ سزا دے اس تقابل سے بھی معلوم ہو رہا ہے کہ جس شخص کو سزا دیدی گئی وہ بری ہو گیا. حنفیہ کا مشہور قول در مختار میں ہے کہ حدود زجر کے لئے ہیں ستر کے لئے نہیں ہیں. لوگوں کو بری باتوں سے روکنا مقصود ہے تاکہ مفاسد کا سد باب ہو جائے. اور ان اخلاقی جرائم پر پابندی لگ جائے جو بدامنی کا پیش خیمہ ہوا کرتے ہیں اور چونکہ قیام امن حد کا مقصد ہے جس کا تعلق صرف دنیوی امور سے ہے آخرت کے معاملات سے اسکا کوئی جوڑ نہیں. فرمایا گیا ہے

ولكم فى القصاص حيوة ۲ پ ۶	قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہے

یعنی اگر قصاص نافذ رہا اور لوگ عبرت کی نگاہ سے قاتلین کا حال دیکھتے رہے تو اس گناہ سے ارتکاب کریں گے تو مقصد ہے نظام کا درستگی سے چلانا، اور بدامنی سے روکنا جب مقصد محض زجر ہے تو اسے قلب کی تطہیر کا ذریعہ نہیں کہہ سکتے. صرف اسا فائدہ ہے کہ اب دنیا میں اسے اس لقب سے نہیں پکار سکتے، ایک شخص کے حد بہا دی گئی لوگوں نے لعنت ملامت شروع کی تو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لا تعينوا عليه الشيطان [1]	شیطان کو اس کے خلاف مدد نہ پہنچاؤ

[1] بخاری کتاب الحدود ص ۱۰۰۳ [2] در مختار کتاب الحدود

ویصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم	یہی سزا ہے کہ قتل کئے جائیں یا سولی دے جائیں یا ان کے
من خلاف او ینفوا من الارض ذلک لھم	ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دیے جائیں یا زمین سے
خزی فی الحیوۃ الدنیا ولھم فی الآخرۃ	نکال دیے جائیں یہ ان کے لئے دنیا میں سخت رسوائی
عذاب عظیم ۔ الا الذین تابوا من	ہے اور انکو آخرت میں عذاب عظیم ہوگا ہاں مگر جو لوگ قبل اس
قبل ان تقدروا علیھم فاعلموا ان	کے کہ تم ان کو گرفتار کرو توبہ کرلیں تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ بخش
اللہ غفور رحیم ۔ پ ۶ ع ۹	دیں گے مہربانی فرمائیں گے

آیت کریمہ میں صرف سزا کے بعد وعدۂ مغفرت نہیں ہے اب یہ بات کہ معاملہ عرنیین کا ہے اور ان کا ارتداد روایت سے ثابت ہے اب اگر یہاں یہ مسئلہ ہو کہ ارتداد کے بعد توبہ کرلی، یعنی شرک سے باز آگیا، تو احناف کی بات کمزور ہے مگر جواب یہ ہے کہ قرآن کے عنوان سے ظاہر ہے کہ معاملہ مرتدین سے مخصوص نہیں ہے بلکہ آیت باغیوں اور حکومت کے مخالفین کے لئے بھی ہے فقہاء نے اسی آیت سے باغیوں اور حکومت کے مخالفین کا حکم مستنبط کیا ہے

اگر ۔ یحاربون ۔ سے ارتداد مراد ہے تو ۔ یسعون ۔ سے بغاوت ہے جو قطع طریق کی صورت میں ہو یا حکومت کے مقابل محاذ بنانے کی صورت میں ۔ بہرکیف اس آیت میں بھی یہی ہے کہ توبہ کے بعد معاملہ صاف ہو جائیگا گا، اب انہیں آیات کریمہ کی روشنی میں ۔ فعوقب فی الدنیا ۔ کے معنی لیجئے یعنی اگر مومن کو دنیوی عقاب ہوگیا تو دنیوی کفارہ بھی ہوگیا یعنی دنیوی امور کے لئے یہ سزا پردہ بن گئی آگے کا معاملہ کہ مغفرت ہوگی یا نہیں اسمیں مذکور نہیں ہے اس آیت سے آخرت کی بات نکالنا اپنی رائے کا اتباع ہے جیسے پہلے سے معین کرلیا ہے کفر کے معنی دراصل چھپانے کے ہیں، کافر کاشتکار کو کہتے ہیں کیونکہ وہ دانہ کو زمین میں چھپادیتا ہے، قبر کو بھی کافر کہدیتے ہیں کیونکہ وہ مردہ کو چھپا لیتی ہے، مردہ اس میں رکھے جانے کے بعد ختم نہیں ہوجاتا، رات کو بھی اسی لئے کافر کہتے ہیں کہ وہ تمام موجودات پر پردہ ڈال دیتی ہے، موجودات کو معدوم نہیں کردیتی ۔ کافر کو بھی کافر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ خداوند قدوس کے بیشمار احسانات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اس لئے ۔ فہو کفارۃ لہ ۔ میں احناف کے واسطے لغوی اعتبار سے بھی گنجائش ہے، ضروری نہیں کہ کفارہ کے معنی محو ہی کے کئے جائیں پھر حدیث میں ۔ حد ۔ نہیں فرمایا گیا بلکہ ۔ عوقب ۔ فرمایا گیا ہے، عقاب عام ہے وہ حد کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے جو ایک تشریعی چیز ہے ۔ اور عقاب تکوینی بھی ہو سکتا ہے مثلاً یہ کہ جرم کے بعد سینکڑوں آلام و مصائب آئے جن سے جرم کی مکافات ہوگئی ۔ روایات میں آتا ہے کہ مومن کو جب تکلیف پہونچتی ہے تو گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے، اس معنی کے اعتبار سے بھی احناف کو چنداں دشواری نہ ہوگی اب اس کے مقابل حضرت ابوہریرہ کی روایت

لا ادری ھل الحدود کفارۃ ام لا [1]

[1] عینی ص ۱۸۱ ج ۱

حدث ذلك لا محالة، العينان زناهما النظر والاذنان زناهما الاستماع واللسان زناه الكلام واليد زناها البطش والرجل زناها الخطى والقلب يهوى ويتمنى ويصدق ذلك الفرج ويكذب به (مسلم ص ۳۳۶ ج ۲)

وہ ضرور ہی ہو پہنچنے والا ہے ، آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے اور کانوں کا زنا سننا ہے زبان کا زنا گفتگو ہے ، اور ہاتھ کا زنا گرفت کرنا ہے ، پیر دل کا زنا چلنا ہے اور دل خواہش اور تمنا کرتا ہے ، اور اس کی تصدیق اور تکذیب فرج کردیتی ہے

یہ شخص گھبرایا ہوا آیا آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم ہمارے ساتھ نماز پڑھو ، نماز کے بعد فرمایا کہ کہاں ہے وہ شخص ، کہتا ہے حاضر ہوں ، فرماتے ہیں معاف ، یہ مثالیں گناہ کے بعد اہمیت محسوس کر کے توبہ کے بعد اقامت حد کی ہیں ، ان میں کفارہ در اصل وہی توبہ بن رہی ہے جس نے اقامت حد کا داعیہ پیدا کیا ، اور اگر کسی نے توبہ نہیں کی ، بلکہ جرم کے ظہور پر حد لگادی گئی ، تو اس کی حد محض انتقامی ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ہر طرح کی حد مطہر ہے بس یہی نقطۂ اختلاف ہے ، احناف محض انتظامی حیثیت دیتے ہیں جیسے کسی نے دابہ سے وطی کرلی تو دابہ کو جلا دیا جائیگا حالانکہ اسمیں دابہ کا کوئی قصور نہیں ہے لیکن یہ ایک انتظامی چیز ہے ، اگر دابہ زندہ رہا تو لوگوں کے لئے خواہ مخواہ تذکرہ کا موجب بنے گا ، اور ممکن ہے کہ یہ تذکرہ لوگوں میں اس خبیث حرکت کا داعیہ پیدا کرے اس لئے اسکو جلا دینا ہی اچھا ہے ، رہا آخرت کا معاملہ وہ سراسر دل اور توبہ سے متعلق ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ احناف کے پاس اس سلسلہ میں کوئی دلیل ہے یا نہیں ، سب سے پہلے ہمیں آیات قرآن پر نظر ڈالنی ہے ، آیت ہے

السارق والسارقة فاقطعوا ايديهما جزاءً بما كسبا نكالا من الله والله عزيز حكيم فمن تاب من بعد ظلمه واصلح فان الله يتوب عليه ان الله غفور رحيم (پ ۶ ع ۱۰)

جو مرد چوری کرے اور جو عورت چوری کرے سو ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو انکے کردار کے عوض بطور سزا کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ بڑی قوت والے ہیں بڑی حکمت والے ہیں پھر جو شخص اس زیادتی کے بعد توبہ کرے اور اعمال درست رکھے تو بیشک اللہ تعالیٰ توجہ فرمادیں گے [illegible]

آیت کریمہ میں صاف ارشاد ہے ——— نكالا من الله ——— ظاہر ہے کہ زجر دنیوی احکام میں ہے اور بعد میں توبہ کا ذکر مستقل طور پر کیا گیا ہے ، فمن تاب من بعد ظلمه . ارشاد فرمایا گیا ہے ، اگر صرف اقامت حد ہی معافی کے لئے کافی ہے تو پھر توبہ کا ذکر کیا معنی رکھتا ہے اسی طرح دوسری آیت میں ارشاد ہے

انما جزاء الذين يحاربون الله ورسوله ويسعون فى الارض فسادا ان يقتلوا

جو لوگ اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلاتے پھرتے ہیں انکی

قبل الہجرۃ کا ذکر اس لئے کیا تاکہ اپنا قدیم الاسلام ہونا ظاہر کردیں، اس لئے کہ قدیم الاسلام ہونا بڑی شرافت ہے اس موقعہ پر عقل حیران ہو جاتی ہے کہ آخر کیا راہ تلاش کی جائے لیکن علامہ ٹھہر کر جواب دیا گیا ضروری ہے کہ عقاب سے حدود ہی مراد لیں، ہوسکتا ہے مصائب مراد ہوں، نیز — اخذ علینا کما اخذ علی النساء۔ کا یہ ترجمہ کرنا بھی معین نہیں ہے کہ جس وقت عورتوں سے بیعت لی اسی وقت ہم سے بھی لی بلکہ بیان واقعہ یوں بھی ہوسکتا ہے کہ ہم سے قبل الہجرۃ جن چیزوں پر بیعت لی گئی تھی یہ وہی چیزیں ہیں کہ جن پر سورۂ ممتحنہ کے بعد عورتوں سے بیعت لی گئی، رہا نزول آیات سے قبل ان چیزوں پر بیعت لینا تو یہ کچھ مستبعد بات نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر ان چیزوں کا القاء پہلے ہی کردیا گیا ہو، ایسی متعدد مثالیں ملیں گی کہ آیت بعد میں نازل ہوئی اور پیغمبر علیہ السلام نے اس کے متعلق پہلے ہی ارشاد فرمادیا، نیز یہ کہ واقعات آپ کی وفات کے بعد بیان ہو رہے ہیں۔ اس لئے ترتیب واقعات میں ایسا ہو جانا بہت حد تک ممکن ہے جیسا کہ اب کسی متوفی کے متعلق کہا جائے کہ اس نے مردوں سے بھی وہی کہا جو عورتوں سے کہا تھا، اس کا مفہوم یہ ہرگز نہیں ہو جاتا کہ دونوں قول ایک ہی مجلس میں ہوئے ہیں۔

بہر کیف حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث حضرات شوافع کے مقصد کے لئے نص نہیں ہے اس میں دوسری جانب کا بھی قوی احتمال ہے، اشکال یہ ہوسکتا ہے کہ تکوینی حدود یعنی مصائب کفارہ بن سکتے ہیں تو تشریعی حدود بدرجہ اولیٰ کفارہ ہو جائیں گی لیکن حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ تشریعی اور تکوینی حدود میں ایک بڑا فرق ہے کہ تشریعی حدود میں مجرم کو جرم کا علم ہوتا ہے، برخلاف تکوینی حدود کے کہ وہاں جرم معلوم نہیں اور اس کے باوجود وہ برداشت کر رہا ہے، خداوند قدوس کی رضا پر رضامند ہے، اس لئے خداوند قدوس نے ان مصائب کو کفارۂ سیئات قرار دیا ہے

اور اگر ان دلائل کو احناف کی پیش کردہ احادیث کی روشنی میں دیکھیں تو استدلال کمزور ہو جاتا ہے جبکہ اس سلسلہ کی دوسری روایات بھی قطعی طور پر صراحت کے ساتھ توبہ کو حد سے بالکل الگ بتلا رہی ہیں

حدیث میں ایک عورت کا قصہ آتا ہے کہ وہ سامان مانگ کر لاتی تھی اور پھر انکار کر دیتی تھی، ایک بار چوری پکڑی گئی پیغمبر علیہ السلام کے گھر سے چادر چرائی، یہ عورت قبیلۂ بنی مخزوم کی تھی، خاندان والوں کو ندامت ہوئی اور انہوں نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے سفارش کے لئے کہا، حضرت اسامہؓ نے سفارش کی تو آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمایا۔

اتشفع فی حد من حدود اللہ (مسلم ص ۶۳ ج ۲) کیا تم اللہ کی حدود میں سفارش کر رہے ہو

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا

پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے جس کو حاکم نے مستدرک میں بسند صحیح روایت کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے بھی جس کو صحیح مانا ہے، اس میں تصریح ہے کہ مجھے معلوم نہیں ہے حدود کفارہ ہیں یا نہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ھ میں مشرف باسلام ہوئے ہیں اس لئے یہ کہنا کہ یہ روایت اس وقت کی ہے کہ جب پیغمبر علیہ السلام کو کفارہ کے متعلق علم نہ تھا اور جب علم ہو گیا تو ——— الحدود کفارۃ ——— فرمادیا، یہ کہنا درست نہیں ہے، شوافع نے ایسا ہی کہا ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے حنفیہ نے کہا کہ یہ روایت لیلۃ العقبہ کی ہے اور وہ بیعت کا واقعہ مکی زندگی کا ہے، حافظ نے اس موقعہ پر کہا ہے کہ یہ واقعہ فتح مکہ کے موقعہ کا ہے، گویا یہ بات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے اسلام کے بعد کی ہے کیونکہ فتح مکہ ۸ھ کی بات ہے، نیز یہ بھی مسلم ہے کہ راوی کا تقدم وتاخر روایت پر اثر انداز نہیں ہوتا ہو سکتا ہے کہ روایت بالواسطہ کی ہو اور پھر بلاواسطہ بھی سن لیا ہو،

علامہ عینی فرماتے ہیں کہ حافظ نے غور نہیں کیا اس میں عصابہ کا لفظ ہے جس کا اطلاق زیادہ سے زیادہ چالیس پر ہو سکتا ہے، یعنی یہ لفظ بتلا رہا ہے کہ حاضرین کی تعداد کم تھی، علاوہ ازیں دوسری روایت میں اس موقعہ پر ——— رھط ——— کا لفظ ہے جس کا اطلاق دس اور کبھی کبھی (بطور ندرت) اس سے زائد پر ہو جاتا ہے، یہ الفاظ جو جماعت کی قلت پر دلالت کر رہے ہیں اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ یہ بیعت عقبہ ہے جو ہجرت سے قبل کی ہے کیونکہ فتح مکہ کی بیعت میں تو ہزاروں انسانوں کی شرکت ہونی چاہیئے کیونکہ اسلام اس وقت ترقی کر چکا تھا

حافظ فرماتے ہیں کہ بیعت عقبہ قبل الہجرہ میں صرف یہ بات ہے کہ اسلام پر بیعت ہے اور اس میں ہے کہ تم میری اس طرح حفاظت کروگے جیسا کہ باپ بچوں، اور خاوند بیوی کی کرتا ہے لیکن علامہ عینی نے کہیں سے اسی بیعت عقبہ قبل الہجرۃ میں بھی یہ الفاظ نکال لئے اور کہا کہ اس وقت آپ نے منکرات کی تفصیل فرمائی اور چونکہ معروف کی تفاصیل اس وقت تک نہ آئی تھیں اس لئے معروف کے سلسلہ میں اجمال فرمایا معلوم ہوا کہ بیعت قبل الہجرۃ ہی مراد ہے

اب حافظ نے پلٹی کھائی اور اس طریق کو چھوڑ دیا کیونکہ مناظرہ کا اصول ہے کہ اگر ایک طریق میں سقم آ جائے، تو دوسری راہ اختیار کرو، حافظ نے کہا کہ پیغمبر علیہ السلام نے بیعت میں جس چیز کا ذکر فرمایا ہے یہ وہی ہے جو عورتوں سے بیعت کے وقت فرمائی گئی ہیں جیسا کہ ایک روایت میں ہے

اخذ علینا کما اخذ علی النساء (مسلم ج ۲ ص ۴۳) ہم سے ان ہی دفعات پر بیعت لی جن پر عورتوں سے لی تھی

اور یہ واقعہ اس طرح صلح حدیبیہ کے بعد کا ہے کیونکہ یہ بیعت سورۂ ممتحنہ کے نزول کے بعد ہے اور سورۂ ممتحنہ کا نزول صلح حدیبیہ کے بعد ہے اور بیعت آیت

اذا جاءك المومنات یبایعنك ؕ پ ۲۸ جب آپ کے پاس مسلمان عورتیں بیعت کیلئے آئیں

کے بعد ہے، رہا حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی شرکت کا معاملہ تو وہ دونوں جگہ شریک ہیں، اور انہوں نے بیعت عقبہ

محاسن اسلام

"محاسن اسلام" حضرت تھانوی قدس سرہٗ العزیز کی وہ معرکۃ آلآرا کتاب ہے جس نے عوام وخواص سے قبولیت عام کی سند حاصل کی ہے اور بارہا خراج تحسین حاصل کیا ہے، یہ دراصل حضرت قدس سرہٗ کا وہ وعظ ہے جو آپ نے قصبہ انچولی میں اپنے خاص عقیدتمندوں کی فرمائش پر کئی گھنٹے مسلسل بیان کیا تھا— کتاب میں اسلام کی خوبیں اور مخالفین کے اعتراضات و شبہات اور ان کے دندان شکن جوابات نہایت عمدہ طریقہ پر بیان کئے گئے ہیں، اچھوت اقوام کی تبلیغ کا بہترین طریقہ اس میں موجود ہے۔ ارتداد فتنہ سے بچانے کی صورتیں ذکر کی گئی ہیں۔

یہ کتاب نایاب تھی اب اراکین مجلس قاسم المعارف نے عنوانات اور دل نشیں ترتیب کے ساتھ اس کو شائع کیا ہے:—

سائز $\frac{20\times30}{16}$ صفحات ۱۴۴۔

—قیمت عام ایک روپیہ پچاس نئے پیسے، کمیشن لہ فی روپیہ

مقالات شیخ الہندؒ

کتاب کی عمدگی کے لئے صرف حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز کا اسم گرامی ہی ضامن ہے

یہ کتاب حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے دو گرانقدر اور نایاب مقالات پر مشتمل ہے۔

پہلے مقالہ میں وحی کی تحقیق اور اس کی تقسیم پر نادر تحقیقات بیان فرمائی ہیں۔

دوسرے مقالہ میں امانت و دیانت پر وجد آفریں بحث ہے۔

بہت عرصہ پہلے ایک صاحب خیر کی کوششوں سے یہ علمی ذخیرہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا تھا۔ اس کی طباعت میں شیخ الاسلام قدس سرہٗ نے بھی کافی دلچسپی لی تھی، لیکن ایک عرصہ سے مارکیٹ میں یہ کتاب نایاب ہو گئی تھی، اب اراکین مجلس قاسم المعارف نے گلیز کاغذ، عمدہ کتابت اور تصحیح کے خاص اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے:—

سائز $\frac{20\times30}{16}$ ۔ صفحات تقریباً ایک سو، قیمت ایک روپیہ—

"کمیشن لہ فی روپیہ"

لاقامۃ حد من حدود اللہ خیر من الدنیا و ما فیہا
حدود اللہ میں سے کسی ایک کا بھی قائم کرنا اللہ کے نزدیک دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے

اس کے بعد ہاتھ کاٹ دیا گیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ اس کے بعد وہ ضرورت لیکر ہمارے یہاں آتی تھی میں ضرورت کو پورا کرتی تھی، آگے ہے

فحسنت توبتہا مسلم ص ج ۲
پس ان کی توبہ اچھی رہی

ہاتھ کٹنے کا ذکر الگ ہے اور توبہ کا الگ اسی لئے احناف کے یہاں حد کے بعد توبہ کی ضرورت رہجاتی ہے طحاوی میں روایت موجود ہے کہ ایک چور آپ کی خدمت میں حاضر کیا گیا اس کے پاس سامان نہ تھا آپ نے فرمایا

ما اخالک سرقت طحاوی ص ۹۶ ج ۲
میرے خیال سے تم نے چوری نہیں کی

لیکن اس نے عرض کیا

بلی یا رسول اللہ
کیوں نہیں! یا رسول اللہ

چنانچہ آپ نے قطع ید کا حکم دیدیا پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا

قل استغفر اللہ واتوب الیہ (ایضاً)
یہ کہو کہ میں اللہ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اور اسکی طرف رجوع کرتا ہوں

پھر آپ نے خود ہی فرمایا

اللّٰھم تب علیہ (ایضاً)
اے اللہ اس کی توبہ قبول فرمالے

اگر حد خود ہی توبہ کے قائم مقام ہوجاتی تو آپ اس کو توبہ کا حکم نہ فرماتے، اور نہ خود ہی اس کے لئے دعا فرمانے کی ضرورت ہوتی۔

تم الجزء الثانی من ایضاح البخاری ویتلوہ الجزء الثالث ان شاء اللہ تعالٰی واولہ باب من الدین الفرار من الفتن۔